# تقدیرِ الٰہی

(خطاب جلسہ سالانہ ۱۹۱۹ء)

از

سیدنا حضرت میرزا بشیرالدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

# مسئلہ قضاء وقدر

ذیل میں مسئلہ تقدیر کے متعلق میری وہ تقریر درج ہے جو میں نے دسمبر ۱۹۱۹ء کے سالانہ جلسہ پر کی تھی بوجہ قلت وقت کے میں نے اس تقریر کو بہت مختصر کر دیا تھا۔ اور میرا منشاء تھا کہ صحت کے وقت اس کے اندر بعض ضروری مسائل بڑھادوں گا۔ لیکن نظر ثانی کے وقت معلوم ہؤا کہ تقریر کے لکھنے میں اس قدر غلطیاں ہوگئی ہیں کہ اس کا درست کرنا نہایت مشکل ہے۔ بعض جگہ مضمون ایسا خبط ہو گیا تھا کہ اس کے درست کرنے میں نیا مضمون لکھنے سے بہت زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔ ایک اور بھی مشکل پیش آگئی کہ مضمون میں خبط ہو جانے کی وجہ سے بعض ضروری مسائل کا بیچ میں شامل کر دینا بھی مشکل ہو گیا۔ اس لئے میں نے اپنا پہلا ارادہ ترک کرکے اسی تقریر کو ہی درست کر دیا ہے اور کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ آسانی سے سمجھ میں آسکے اور ایک دو جگہ پر کسی قدر زیادتی بھی کر دی ہے۔ چونکہ اس مضمون کے بعض پہلو جو زیادہ وضاحت چاہتے تھے اور جن کو تقریر کے وقت بیان نہیں کیا جاسکا اس تقریر پر نظر ثانی کرتے وقت بھی درج نہیں ہو سکے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اگر توفیق دے تو میرا ارادہ ہے کہ اس مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ تحریر کر دیا جاوے۔ فی الحال لوگوں کے انتظار کو دیکھ کر اسی قدر شائع کیا جاتا ہے۔

خاکسار
مرزا محمود احمد

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

# تقدیرِ الٰہی

(خطاب جلسہ سالانہ ۲۸/۲۹ دسمبر ۱۹۱۹ء)

اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ○ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ○ اٰمِیْن

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا ○ وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ○ (الطلاق: ۳، ۴)

وَقَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ شَیْءٍ ؕ کَذٰلِکَ فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ۚ فَھَلْ عَلَی الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ○ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْھُمْ مَّنْ ھَدَی اللّٰہُ وَمِنْھُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْہِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُکَذِّبِیْنَ ○ (النحل: ۳۶، ۳۷)

### مسئلہ قضاء و قدر کی اہمیت

میں نے کل بیان کیا تھا کہ میں ایک اہم مسئلہ کے متعلق آپ لوگوں کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ مسئلہ ایمانیات کے متعلق ہے۔ پہلے جلسوں میں مَیں نے اپنی تقریروں میں اعمال کے متعلق زیادہ تر بیان کیا ہے مگر اس دفعہ ارادہ ہے کہ ایمانی امور کے متعلق کچھ بیان کروں۔ اس

ارادہ کے ماتحت اس دفعہ میں نے اس مسئلہ کو چنا ہے جو میرے نزدیک اہم امور ایمانیہ میں سے ہے اور نہایت مشکل مسئلہ ہے حتیٰ کہ لوگوں کے اعمال پر اس کا خطرناک اثر پڑا ہے۔ وہ مسئلہ کیا ہے؟ وہ قضاء و قدر کا مسئلہ ہے جس کو عام طور پر تقدیر یا قسمت یا مقدر کہتے ہیں۔ اور اس کے مختلف نام رکھے ہوئے ہیں۔ مسئلہ تقدیر ایمانیات میں سے ہے اور بہت مشکل مسئلہ ہے۔ بہت لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے ہیں اور کئی قومیں اسی کو نہ جاننے کی وجہ سے تباہ ہو گئی ہیں۔ کئی مذاہب اسی کے نہ معلوم ہونے کی وجہ سے برباد ہو گئے ہیں۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ اسی مسئلہ کے نہ سمجھنے کی وجہ سے مذاہب میں ایسی تعلیمیں جو انسان کے اخلاق اور اعمال کو تباہ و برباد کرنے والی ہیں آگئی ہیں۔ اور یورپ کے لوگ مسلمانوں پر عموماً اس مسئلہ کی وجہ سے ہنسا کرتے ہیں۔ لیکن وہ بلاوجہ نہیں ہنستے بلکہ ان کا ہنسنا جائز ہوتا ہے کیونکہ مسلمان ان کو خود اپنے اوپر ہنسی کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ مثلاً اگر کبھی مسلمانوں کی لڑائی کا ذکر آجائے تو یوروپین مصنف لکھیں گے کہ فلاں موقع پر بڑے زور شور سے گولیاں چلتی رہیں لیکن مسلمان پیچھے نہ ہٹے بلکہ آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ آگے یہ نہیں لکھیں گے کہ یہ ان کی بہادری اور شجاعت کا ثبوت تھا بلکہ لکھیں گے کہ اس لئے کہ انہیں اپنی قسمت پر یقین تھا کہ اگر مرنا ہے تو مرجائیں گے اگر نہیں مرنا تو نہیں مریں گے۔ اگر مسلمان اس وجہ سے دشمن کے مقابلہ میں قائم رہا کرتے تو بھی کوئی حرج نہ تھا لیکن اگر گولیاں زیادہ دیر چلیں تو پھر وہ کھڑے نہیں رہیں گے بلکہ بھاگ جائیں گے۔

## مسئلہ تقدیر کے متعلق رسول کریم ﷺ کا ارشاد

غرض تقدیر پر ایمان لانا ایک اہم مسئلہ ہے اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک خدا کی قدر پر ایمان نہ لائے۔ آپ فرماتے ہیں کہ

"لَا یُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ" (ترمذی ابواب القدر باب ماجاء فی الایمان بالقدر خیرہٖ وشرہٖ)

یعنی کوئی بندہ مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک قدر پر ایمان نہ لاوے اچھی قدر پر بھی اور بری قدر پر بھی۔

پھر فرماتے ہیں "مَنْ لَمْ یُؤْمِنْ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ فَاَنَا بَرِیْءٌ مِّنْہُ۔

(کنز العمال جلد ۱ الفصل السادس فی الایمان بالقدر روایت نمبر ۴۸۵)

جو شخص اچھی اور بری قدر پر ایمان نہیں لاتا میں اس سے بیزار ہوں۔ گویا اس مسئلہ کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ پس قدر کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے اور جب کوئی ایمان حاصل کرنے کے لئے گھر سے نکلے اور چاہے کہ ایمان لانے والوں میں جگہ پائے تو اس کے لئے نہایت ضروری ہے کہ اس پر ایمان لائے اور یقین رکھے۔ لیکن اگر کوئی دعویٰ تو کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہے لیکن قدر کو نہیں مانتا تو رسول کریم ﷺ کی تعلیم کے ماتحت وہ مسلمان نہیں کہلا سکتا کیونکہ مسلم آپؐ ہی کے خدام اور متبعین کا نام ہے اور اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ کون مسلمان ہے اور کون نہیں آپؐ ہی سے فیصلہ چاہا جائے گا۔ پس وہ شخص مسلم نہیں جو قدر پر ایمان نہیں لاتا کیونکہ آپؐ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص اس وقت تک مسلم نہیں ہو سکتا جب تک قدر پر ایمان نہیں لاتا۔

## مسئلہ تقدیر ایمانیات میں داخل ہے

ممکن ہے بعض لوگوں کے دل میں خیال ہو اور ہو سکتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے جس طرح بعض اور باتوں کو ضروری دیکھ کر محض زور دینے کے لئے ایمان میں شامل کیا ہے اسی طرح قدر کا مسئلہ ہو۔ مثلاً آپؐ نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی غیر قوم کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے۔ (مثلاً سید نہیں ہے اور اپنے آپ کو سید کہتا ہے) مؤمن نہیں ہے (ابو داؤد- ابواب النوم باب فی الرجل ینتمی الی غیر موالیہ) یا آپؐ نے فرمایا ہے کہ مسلمان کا قتل کرنا کفر ہے۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ا صفحہ ۱۷۶) اسی طرح اور کئی باتوں کے متعلق آپؐ نے فرمایا ہے کہ جو ایسا نہیں کرتا یا ایسا کرتا ہے وہ مؤمن نہیں ہے مثلاً جس طرح آپؐ نے یہ فرمایا ہے کہ جو پٹھان ہے اور اپنے آپ کو سید کہتا ہے یا مغل ہے اور سید بنتا ہے یا کسی بڑے آدمی کی نسل نہیں ہے مگر اس کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے وہ مؤمن نہیں ہے۔ اسی طرح مسئلہ قضاء و قدر کے متعلق فرما دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ضرور مان لیا جائے۔ پس اس کو نہ ماننا گناہ ہے اور بڑا گناہ ہے مگر ایمان اور اسلام سے خارج کر دینے والا نہیں ہے۔

اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ جتنے ایمانی مسئلے ہیں اور جن پر ایمان لائے بغیر کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا قرآن کریم میں موجود ہیں اور ان کا انحصار حدیثوں پر نہیں ہے کیونکہ حدیثوں کا علم ظنی ہے یقینی نہیں ہے۔

پس اس بات کو معلوم کرنے کے لئے کہ کون سا مسئلہ حقیقتاً ایمانیات میں شامل ہے ہمیں قرآن کریم کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ جس مسئلہ کے متعلق قرآن کریم میں معلوم ہو جائے کہ اس کا نہ ماننا کفر ہے وہ ایمانیات میں شامل ہے اور جس کے متعلق قرآن کریم کی شہادت نہ ملے اس کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے متعلق جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ صرف تاکید اور زور دینے کے لئے ہیں۔ اب اسی قاعدہ کے ماتحت جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں کہ اس میں ایمان بالقدر کے متعلق کیا بیان ہؤا ہے تو گو ہمیں ایمان بالقدر کے الفاظ تو اس میں نظر نہیں آتے مگر یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا سب سے پہلا حکم بتایا گیا ہے اور مسئلہ قدر خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کا ایک حصہ ہے۔ قدر کیا ہے؟ قدر خدا تعالیٰ کی صفات کے ظہور کا نام ہے۔ مثلاً جو شخص یہ مانتا ہے کہ خدا ہے اس کے لئے یہ بھی ماننا ضروری ہے کہ خدا کچھ کرتا بھی ہے نہ کہ ایک بے حس و حرکت ہستی ہے۔ تو جو صفات خدا تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں انہی کے ماننے کا نام قدر کا ماننا ہے اس لئے ایمان باللہ میں ہی قدر پر ایمان لانا بھی آگیا۔

پس رسول کریم ﷺ کا ایمان بالقدر پر زور دینا کبیرہ گناہوں پر زور دینے کے مشابہ نہیں ہے بلکہ اس کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے وہ حقیقی طور پر بھی ہے۔

## خدا تعالیٰ کے ماننے کے لئے تقدیر کا ماننا ضروری ہے

قرآن کریم میں گو اس مسئلہ کو علیحدہ علیحدہ طور پر نہیں بیان کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ پر ہی ایمان لانے میں اس کو شامل کیا گیا ہے۔ مگر رسول کریم ﷺ نے اس کو علیحدہ کر کے بیان کر دیا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کو اسی وقت حقیقی طور پر مانا جاتا ہے جبکہ اس کی صفات کو بھی مانا جائے۔ ورنہ یوں خدا کا مان لینا کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ یوں تو بہت سے دہریے بھی مانتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے کہ ہم خدا کو نہیں مانتے۔ ہم خدا کو تو مانتے ہیں ہاں یہ نہیں مانتے کہ وہ فرشتے نازل کرتا ہے' نبی بھیجتا ہے' اس کی طرف سے پیغام آتے اور کتابیں دی جاتی ہیں۔ لیکن ہم یہ مانتے ہیں کہ اس کائنات کو چلانے والی ایک بڑی طاقت ہے جسے ہم قوت محرکہ کہتے ہیں۔

تو دہریے بھی بظاہر خدا کے ماننے کا انکار نہیں کرتے۔ مگر وہ کیسا خدا مانتے ہیں؟ ایسا کہ جس سے ان کو کوئی کام نہ پڑے۔ ان کا خدا کا ماننا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی نے کسی کو کہا تھا۔ جو

ہمارا مال سو تمہارا مال اور اس کا یہ قطعاً خیال نہ تھا کہ میرا مال یہ لے بھی لے۔ اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم مانتے ہیں ایک ہستی ہے ایک طاقت ہے ایک روح ہے مگر ایسا خدا جو ہمیں حکم دے کہ اس طرح کرو اور اس طرح نہ کرو اس کے ہم قائل نہیں ہیں۔ اس قسم کے دہریوں کے عقیدے موجود ہیں۔ اگر اسی طرح کا خدا کے متعلق کسی کا ایمان ہو تو یہ تو دہریوں کا بھی ہوتا ہے اور یہ کافی نہیں ہوتا۔ پس خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک ذات ہے بلکہ یہ بھی ہیں کہ اس کی صفات کو بھی مانا جائے۔ پھر یہی نہیں کہ خدا کی صفات مان لے بلکہ یہ بھی ہے کہ ان کا ظہور مانے اور یہی قدر ہے۔ گویا خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اول ذات اللہ پر ایمان لائے۔ دوسرے صفات اللہ پر ایمان لائے۔ تیسرے صفات کے ظہور پر ایمان لائے۔ اس تیسری شق کا رسول کریم ﷺ نے قدر نام رکھ کر علیحدہ بیان کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی جن صفات کے ظہور کا تعلق بندوں سے ہے اس کا نام قدر ہے۔

## قضاء و قدر کے متعلق فکر اور تنازع

ادھر ایمان بالقدر ایسی ضروری چیز ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ کوئی مؤمن ہی نہیں ہو سکتا جب تک قدر پر ایمان نہ لائے۔ اور یہ محض زور دینے کے لئے نہیں فرمایا بلکہ قرآن کریم فرماتا ہے کہ صفات الٰہیہ پر ایمان لانا جزو ایمان ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک نہایت سخت بات بھی لگی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایمان بالقدر ایسی مشکل چیز ہے کہ اس کے متعلق فکر اور تنازع کرنا انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ

خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِى الْقَدْرِ - فَغَضِبَ حَتّٰى احْمَرَّ وَجْهُهٗ حَتّٰى كَاَنَّمَا فُقِئَ فِىْ وَجْنَتَيْهِ الرُّمَّانُ فَقَالَ اَبِهٰذَا اُمِرْتُمْ اَمْ بِهٰذَا اُرْسِلْتُ اِلَيْكُمْ اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حِيْنَ تَنَازَعُوْا فِىْ هٰذَا الْاَمْرِ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ اَلَّا تَنَازَعُوْا فِيْهِ۔ (ترمذی ابواب القدر باب ماجاء فی التشدید فی الخوض فی القدر)

ہم لوگ قضاء و قدر کے مسئلہ کے متعلق بیٹھے ہوئے جھگڑ رہے تھے کہ رسول کریم ﷺ باہر تشریف لائے ہماری باتوں کو سن کر آپؐ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا

آپ ؐ کے منہ پر انار کے دانے توڑے گئے ہیں اور آپ ؐ نے فرمایا کہ کیا تم کو اس بات کا حکم دیا گیا تھا؟ کیا خدا نے مجھے اسی غرض سے بھیجا تھا؟ تم سے پہلی قومیں صرف قضاء و قدر کے مسئلہ پر جھگڑا کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہیں۔ میں تمہیں تاکید کرتا ہوں میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ اس امر میں جھگڑنا اور بحث کرنا چھوڑ دو۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس کوئی شخص آیا اور کہا کہ آپ کو فلاں شخص سلام کہتا تھا۔ آپ نے جواب دیا کہ مجھے معلوم ہؤا ہے کہ اس نے اسلام میں کچھ بدعات نکالی ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو میری طرف سے اس کو سلام کا جواب نہ دینا کیونکہ میں نے رسول کریم ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ؐ کی امت میں سے بعض پر عذاب آئے گا اور یہ قدر پر بحث کرنے والے لوگ ہوں گے۔ (ترمذی ابواب القدر باب ما جاء فی الرضا بالقضاء)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قدر کا مسئلہ ایک مشکل مسئلہ ہے جس پر بحث کرنے پر سلب ایمان کا خطرہ ہے بلکہ رسول کریم ﷺ نے پیشگوئی کی ہے کہ اس امت میں سے ایک جماعت پر اسی سبب سے عذاب آوے گا۔ مگر ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس مسئلہ پر ایمان لانے کی بھی بڑی سختی سے تاکید کی گئی ہے اور اس کے نہ ماننے والے کو کافر قرار دیا گیا ہے اور کسی مسئلہ پر ایمان اسے سمجھے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ جب تک کسی شخص کو یہ معلوم نہ ہو کہ میں نے کس بات کو ماننا ہے وہ مانے گا کیا؟ اور ایسی بات کے منوانے سے جس کو انسان سمجھے نہیں فائدہ ہی کیا ہو سکتا ہے؟

پس مسئلہ تقدیر کے متعلق ہمیں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ شریعت نے جب اس مسئلہ میں جھگڑنے سے منع کیا ہے تو اس کا کیا مطلب ہے؟ اور جب اس پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے تو اس کا کیا مطلب ہے؟ تا ایسا نہ ہو کہ بے احتیاطی کے نتیجہ میں ہلاکت اور تباہی کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ مسئلہ درحقیقت ایک دینوی پل صراط ہے کہ اگر اس پر قدم نہ رکھے تو جنت سے محروم رہ جاتا ہے اور اگر رکھے تو ڈر ہے کہ کٹ کر دوزخ کے تہہ خانے میں نہ جا پڑے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ جس طرح پل صراط پر قدم رکھے بغیر تو کوئی انسان جنت میں جا ہی نہیں سکتا اور اس پر چلنے میں دونوں امکان ہیں گر جائے یا بچ جاوے۔ اسی طرح مسئلہ تقدیر کا حال ہے اس کو نہ سمجھے تو ایمان بالکل جاتا رہتا ہے اور اگر اس پر بحث کرے تو دونوں

باتیں ہیں خواہ صحیح سمجھ کر قرب الی اللہ حاصل کرے خواہ غلط سمجھ کر تباہ و برباد ہو جاوے۔

اس جگہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہی بات تھی تو رسول کریم ﷺ نے یہ کیوں فرمایا کہ اس مسئلہ پر بحث نہ کرو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپؐ کا مطلب یہ نہ تھا کہ مطلق بحث نہ کرو۔ بلکہ یہ کہ عقلی ڈھکوسلوں سے کام نہ لو بلکہ اس مسئلہ کو ہمیشہ شریعت کی روشنی میں دیکھو اور اگر آپؐ کا یہ مطلب نہ ہوتا تو ہم خود رسول کریم ﷺ کو اس مسئلہ کے متعلق مختلف اوقات میں تفصیلات بیان کرتے ہوئے نہ پاتے۔ آپؐ کا خود اس مسئلہ کی تشریح کرنا اور اس پر جو اعتراض وارد ہوتے ہیں ان کا جواب دینا پھر قرآن کریم کا اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کرنا بتاتا ہے کہ جس بات سے منع کیا گیا ہے وہ اس مسئلہ کی تحقیق نہیں بلکہ اس مسئلہ کو شریعت کی مدد کے بغیر حل کرنا ہے۔ اور یہ بات واقع میں ایسی خطرناک ہے کہ اس کا نتیجہ دہریت' بے دینی اور اباحت کے سوا اور کچھ نہیں نکل سکتا۔ قدر کا مسئلہ خدا تعالیٰ کی صفات سے تعلق رکھتا ہے۔ پس اگر کوئی اس مسئلہ کو حل کر سکتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ خدا اور اس کے رسولؐ کے سوا کسی کی طاقت اور مجال نہیں کہ اس مسئلہ کی حقیقت بیان کر سکے۔ عقل اس میدان میں ایسی ہی بے بس ہے جیسے ایک چھ ماہ یا سال کا بچہ ایک خطرناک جنگل میں۔ اس کو اس جنگل سے اگر کوئی چیز نکال سکتی ہے تو وہ شریعت کی رہبری ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ مسئلہ عقل میں آہی نہیں سکتا بلکہ میرا یہ منشاء ہے کہ عقل بلا شریعت کی رہبری کے اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتی۔ اللہ تعالیٰ کے بتانے پر اس کی ہدایت سے عقل اس مسئلہ کو خوب سمجھ سکتی ہے اور اگر عقل انسانی اس کو تب بھی سمجھ نہ سکتی تو اس پر ایمان لانے کا حکم بھی نہ ملتا۔

جن لوگوں نے اس مسئلہ کو عقل کے ذریعہ حل کرنا چاہا ہے وہ بڑی بڑی خطرناک گمراہیوں کا شکار ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔

## مسئلہ تقدیر کے نہ سمجھنے کا نتیجہ

چنانچہ ہندوؤں میں تناسخ کا مسئلہ تقدیر ہی کے نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہؤا ہے اور عیسائیوں میں کفارہ کا مسئلہ اسی کے نہ جاننے کی وجہ سے بنایا گیا۔ اول تو رحم کا انکار کیا گیا اس کے نتیجہ میں کفارہ کا مسئلہ پیدا ہؤا اور کفارہ کے نتیجہ میں ابنیت اور شریعت کو لعنت قرار دینے کے مسائل پیدا ہوئے اور پھر لازمی طور پر اباحت کا مسئلہ پیدا ہؤا۔ اسی طرح قدر ہی کے مسئلہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یورپ کے موجودہ سائنس دانوں میں دہریت آئی۔ پھر اسی کے نہ سمجھنے سے یہودیوں میں

نجات خاص کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔

پس یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور اس کو نہ سمجھ کر ہندوؤں میں تناسخ' عیسائیوں میں کفارہ اور یہودیوں میں نجات خاص' سائنس دانوں میں دہریت اور مسلمانوں میں ایک طرف اباحت اور دوسری طرف ذلت و نکبت آئی ہے۔ اگر یہ لوگ اس مسئلہ کو سمجھتے تو کبھی ٹھوکر نہ کھاتے۔ چنانچہ قرآن کریم مختلف اقوام کی گمراہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ۔ (الانعام:۹۲)

انہوں نے خدا تعالیٰ کی صفات کے مسئلہ کو اچھی طرح نہیں سمجھا اسی سے ٹھوکر کھا کر انہوں نے نئے نئے عقیدے پیدا کر لئے۔

تو تمام مذاہب کی حقیقت اور اصلیت سے پھر جانے کی یہی وجہ ہے کہ ان کے پیروؤں نے صفات الٰہیہ کے ظہور کے مسئلہ کو یعنی تقدیر کو صحیح طور پر نہ سمجھا۔

پس یہ نہایت نازک مسئلہ ہے اور اس میں بہت غور و تحقیق اور بہت بڑی احتیاط کی ضرورت ہے تاکہ انسان ایک طرف ایمان پر قائم ہو جائے اور دوسری طرف خدا کے غضب سے بھی بچا رہے ورنہ بغیر اس کی تحقیق اور اس کے جاننے کے اس کا ماننا ہی کیا ہؤا؟ کیا کہیں خدا تعالیٰ نے کہا ہے کہ اگر ہمالیہ پہاڑ کو مان لو کہ پہاڑ ہے یا راوی دریا کو مان لو کہ دریا ہے یا لاہور شہر کو مان لو کہ شہر ہے تو نجات پا جاؤ گے؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ ان چیزوں کا ماننا نجات کا باعث نہیں ہو سکتا کیونکہ نجات کا باعث وہی چیزیں ہو سکتی ہیں اور روحانیت کی ترقی انہی چیزوں سے ہو سکتی ہے جو روحانیت سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا ماننا یہی ہے کہ ان کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھا جائے اور اگر ان کی حقیقت کو نہ سمجھا جائے تو پھر ماننا کیسا؟

## مسلمانوں نے مسئلہ تقدیر میں بیہودہ طور پر دخل دیا

پس اس مسئلہ کو ماننے کے لئے اس کے متعلق نہایت غور و فکر کی ضرورت ہے مگر ادھر رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس مسئلہ میں جن قوموں نے تنازع کیا ہے وہ ہلاک کی گئی ہیں اور میری امت میں سے بھی ایک قوم ہوگی جو اسی وجہ سے مسخ کی جائے گی (ترمذی۔ ابواب القدر باب ماجاء فی الرضاء بالقضاء) مگر باوجود اس کے کہ رسول کریم ﷺ نے اس میں تنازع نہ کرنے کے متعلق تاکید فرمائی ہے اور باوجود اس کے کہ اسے ایمان کا جزو قرار دیا ہے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے نہایت بیہودہ طور پر اس میں

دخل دیا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنے عقیدے کی خدا تعالیٰ کے بیان یعنی قرآن کریم پر بناء رکھتے انہوں نے اپنی عقل پر بناء رکھی اور پھر قرآن کریم سے اس کی تائید چاہی۔ اور قرآن وہ ہے جو کہتا ہے

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (بنی اسرائیل:۲۱)

پھر وہ ہر مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو بیان کرتا ہے۔ اب اگر کوئی کسی مسئلہ کے ایک پہلو کو لے لے اور باقیوں کو چھوڑ دے تو وہ کہے گا تو یہی کہ میں نے قرآن سے لیا ہے لیکن دراصل اس نے قرآن سے نہیں لیا بلکہ قرآن کو آڑ بنا لیا ہے۔ اگر وہ قرآن سے لیتا تو اس کے سب پہلوؤں کو لیتا نہ کہ ایک پہلو کو لے لیتا اور باقیوں کو چھوڑ دیتا۔

ایک دفعہ میں ایک جگہ گیا۔ اس وقت میں چھوٹا بچہ تھا اور مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ وہاں میں نے بورڈنگ میں دیکھا کہ ایک لڑکا ریوڑیاں کھا رہا تھا اور ایسی طرز پر کھا رہا تھا کہ اس کی حالت قابل ہنسی تھی۔ یعنی ریوڑیوں کو اس نے چھپایا ہؤا تھا جیسے ڈرتا ہے کہ اور کوئی نہ دیکھ لے۔ مجھے ہنسی آگئی اور میں نے پوچھا یہ کیا کرتے ہو؟ کہنے لگا سنا ہے حضرت مسیح موعودؑ کو ریوڑیاں پسند ہیں اس سنت کو پورا کرتا ہوں۔ میں نے کہا آپ تو کونین بھی کھاتے ہیں وہ بھی کھاؤ۔

## ایک پہلو لے لینا اور دوسرا چھوڑ دینا

تو جہاں انسان اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے وہاں ہمیشہ ایسی باتوں کو لے لیتا ہے جو اس کے حق میں مفید ہوں اور دوسری باتوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ مگر جو لوگ حق کے طالب ہوتے ہیں وہ سب پہلوؤں کو مدِّ نظر رکھتے ہیں اور یہ پرواہ نہیں کرتے کہ اس طرح ہمارے خیال یا میلان کے خلاف کوئی اثر پڑے گا۔ اب اسی اختلاف کو دیکھ لو جو ہماری جماعت میں ہؤا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ میں شرعی نبی نہیں۔ ہاں ایسا نبی ہوں کہ رسول کریم ﷺ کا خادم ہونے کی وجہ سے نبوت کا درجہ ملا اور میں امتی نبی ہوں۔ اب ایک دو آدمی اٹھے جو کہتے ہیں کہ اگر نبی کے لئے شریعت لانا ضروری ہے تو حضرت مسیح موعودؑ بھی کہتے ہیں کہ میں احکام شریعت لایا ہوں پس آپ شرعی نبی ہوئے۔ انہوں نے دوسرا پہلو چھوڑ دیا پھر کچھ اور لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ حضرت صاحبؑ نے لکھا ہے کہ میں نبی نہیں ہوں پس آپؑ کسی قسم کے نبی نہیں۔ انہوں نے بھی دوسرا پہلو چھوڑ دیا۔ لیکن ہم دونوں پہلوؤں کو لیتے ہیں کہ حضرت صاحبؑ شریعت والے نبی نہیں ہیں لیکن امتی نبی ہیں۔ اگر اختلاف کرنے والے لوگ دونوں

پہلوؤں کو لیتے تو ٹھوکر نہ کھاتے۔ ہم نے دونوں پہلوؤں کو لیا ہے کہ آپ نبی بھی ہیں اور امتی بھی۔ تو یہ عام قاعدہ ہے کہ جن لوگوں میں تقویٰ اور دیانت نہیں ہوتی اور نہ صاف طور پر انکار کرنے کی جرأت ہوتی ہے وہ یہ طریق اختیار کیا کرتے ہیں کہ ایک حصہ کو لے لیتے ہیں اور دوسرے کو چھوڑ دیتے ہیں اور ایک حصہ کو لے کر کہتے ہیں کہ ہم تو اس کو مانتے ہیں۔ حالانکہ وہ درحقیقت نہیں مانتے جیسا کہ بعض مسلمان کہلانے والے کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم قرآن کے حکم لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ (النساء: ۴۴) پر عمل کرتے ہیں۔ جب کہا جائے کہ اس کے اگلے حصہ کو کیوں چھوڑتے ہو تو کہتے ہیں سارے قرآن پر کون عمل کر سکتا ہے۔

## تقدیر کے متعلق مسلمانوں کے غلط عقائد کی بنیاد

تو یہ ایک فتنہ کا طریق ہوتا ہے اور اس سے رسول کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ لیکن افسوس مسلمانوں نے ممانعت کا کوئی خیال نہ کیا اور اس پر عمل کر کے بڑی بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ان میں سے بعض نے اپنے عقائد کی بنیاد یونانی فلسفہ پر رکھی۔ بعض نے ہندوستان کے فلسفیوں کے عقائد پر رکھی یعنی وحدت وجود پر، بعض نے دہریت پر۔ ہندوستان میں وحدت الوجود کا مسئلہ بہت پھیلا ہؤا تھا۔ اس میں اور تقدیر میں کوئی فرق نہ سمجھا گیا اور اسی کو تقدیر قرار دے دیا گیا اور اس پر اپنے عقائد کی بنیاد رکھ کر یہ سمجھ لیا گیا کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ خدا ہی کراتا ہے بندہ کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ گویا بندہ بندہ ہی نہیں بلکہ خدا ہے۔ ان کے مقابلہ میں دوسروں نے یہ کہا کہ جو کچھ انسان کرتا ہے اس میں خدا کا کوئی دخل نہیں ہے۔ سب کچھ بندہ کے اپنے ہی اختیار میں ہے۔ اس عقیدہ کی بنیاد فلسفہ یونان پر تھی۔ تو ان دونوں فلسفوں پر مسلمانوں نے تقدیر کے متعلق اپنے عقائد کی بنیاد رکھی اور پھر ان حقیقت اور اصلیت سے دور فلسفوں کو قرآن کریم کے ذریعہ مضبوط کرنا چاہا چنانچہ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہمارا چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، چوری کرنا، زنا کرنا، ڈاکہ مارنا، ٹھگی کرنا سب خدا کا ہی فعل ہے ہمارا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہی قرآن سے ثابت ہے۔ اور جنہوں نے کہا کہ خدا پارلیمنٹری حکومت کے بادشاہ جتنا بھی ہمارے افعال میں اختیار نہیں رکھتا۔ ایسا بادشاہ تو پھر بھی احکام پر دستخط کرتا ہے لیکن خدا اتنا بھی نہیں کرتا بلکہ ایک ایسا وجود ہے جس کا دنیا کے کاروبار میں کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ قرآن سے ثابت ہے حالانکہ دونوں کی باتیں غلط ہیں۔

### قرآن ان باتوں کو ردّ کرتا ہے

یہ کہنا کہ جو کچھ انسان کرتا ہے وہ انسان نہیں کرتا بلکہ خدا ہی کرتا ہے۔ اور یہ کہنا کہ جو کچھ کرتے ہیں ہم ہی کرتے ہیں خدا کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ دونوں ایسی تعلیمیں ہیں کہ جن کو عقل ایک منٹ کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتی۔ اور کسی قرآن کریم کے پڑھنے والے کا یہ خیال کر لینا کہ ان میں سے کوئی ایک تعلیم قرآن کریم میں پائی جاتی ہے ایک بیہودہ اور لغو بات ہے۔ میں نے قرآن کریم کو الحمد سے لے کر والناس تک اس بات کو مدنظر رکھ کر پڑھا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق وہ کیا کہتا ہے؟ لیکن میں یقینی طور پر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں اور اگر کوئی اور پڑھے گا تو وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ الحمد کے الف سے لے کر والناس کے س تک ایک ایک لفظ ان دونوں باتوں کو رد کر رہا ہے اور قرآن کریم ان کو جائز ہی کس طرح رکھ سکتا ہے کیونکہ یہ دونوں غلط ہونے کے علاوہ اخلاق کو قتل اور روحانیت کو تباہ کرنے والی ہیں۔ اسلام نے اس مسئلہ کے متعلق وہ تعلیم بیان کی ہے کہ اگر کوئی اسے سمجھ لے تو باخدا اور بڑے باخدا لوگوں میں سے بن سکتا ہے۔ اور اس طرز پر بیان کی ہے کہ کوئی عقل اور کوئی علم اور کوئی فلسفہ اس پر اعتراض نہیں کر سکتا اور بہت مفید تعلیم ہے۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ تقدیر یہ ہے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ خدا ہی کراتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کو قتل کر دیں تو خدا ہی کرتا ہے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اور دوسرے جو یہ کہتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے کاموں میں دخل دینے کی خدا کو کیا ضرورت ہے۔ مثلاً تھوکنا' پیشاب کرنا وغیرہ ان میں خدا کا کیا دخل ہے۔ اگر ان میں خدا کا دخل مانا جائے تو یہ ایک ہتک ہے۔ ان دونوں گروہوں نے قرآن کریم کی جن آیات پر اپنے خیالات کی بنیاد رکھی ہے ان میں سے بعض کے متعلق اس وقت میں بیان کرتا ہوں تا کہ پتہ لگ جائے کہ ان کی بنیاد کیسی بودی ہے۔

### اس خیال کی تردید کہ ہر ایک فعل خدا ہی کراتا ہے

وہ جو یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ انسان کرتا ہے وہ خدا ہی کراتا ہے اس میں انسان کا کچھ دخل نہیں ہوتا وہ اپنی تائید میں سورۃ صافات کی یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ○ (الصّٰفّٰت: ۹۷)

کہ اللہ نے تم کو پیدا بھی کیا ہے اور تمہارے عمل کو بھی پیدا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں جب

ہمیں بھی خدا نے پیدا کیا اور ہمارے عمل کو بھی خدا نے پیدا کیا تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ کر رہا ہے خدا ہی کر رہا ہے۔ پھر کون ہے جو کہے کہ میں کچھ کرتا ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس آیت نے اس مسئلہ کو ان کے خیال کے مطابق صاف طور پر حل کر دیا ہے۔ لیکن درحقیقت انہوں نے وہی غلطی کھائی ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے آیت کا ایک ٹکڑا لے لیا ہے اور دوسرے کو ساتھ نہیں ملایا۔ اسی آیت سے پہلی آیت یہ ہے۔

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝ (الصّٰفّٰت:۹۶)

عربی قاعدہ کے لحاظ سے ما کبھی فعل پر آکر اس کے معنی مصدر کے کر دیتا ہے اور کبھی وہ موصولہ ہوتا ہے جس کا ترجمہ اردو میں "جو" یا "وہ جو" کرتے ہیں جو لوگ وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ کے معنی یہ کرتے ہیں کہ اللہ نے تم کو بھی پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو بھی۔ وہ اس جگہ مصدر کے معنی لیتے ہیں۔ لیکن پہلی آیت سے ظاہر ہے کہ یہاں مصدر کے معنی نہیں کیونکہ پہلی آیت یہ ہے کہ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ کو ملا کر پڑھا جائے اور اس کے یہ معنی کئے جائیں کہ "حالانکہ اللہ نے تم کو بھی پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو بھی۔" تو اس آیت کے معنی ہی کچھ نہیں بنتے۔ اور دوسری آیت پہلی کو رد کر دیتی ہے۔ کیونکہ پہلی آیت میں تو یہ بتایا گیا ہے کہ تم کیوں اس چیز کو پوجتے ہو جسے خود خراد کر بناتے ہو۔ اور دوسری میں یہ بتایا گیا ہے کہ تم کو بھی اور تمہارے اعمال کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے۔ اور یہ عبارت نہ صرف بے جوڑ ہے بلکہ الٹ ہے کیونکہ جب خدا نے ہی ان کے عمل پیدا کئے ہیں تو ان سے کیوں پوچھا جاتا ہے کہ تم بتوں کو کیوں پوجتے ہو؟

پس یہ معنی اس آیت کے ہو ہی نہیں سکتے۔ بلکہ ان دونوں آیتوں کے یہ معنی ہیں کہ کیا تم لوگ اس چیز کی پوجا کرتے ہو جس کو خود اپنے ہاتھ سے خرادتے ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور اس چیز کو بھی پیدا کیا ہے جسے تم بناتے ہو یعنی بتوں کو۔ اور "ما" اپنے مابعد فعل کے ساتھ جس طرح پہلی آیت میں مفعول کے معنوں میں ہے اسی طرح دوسری آیت میں بھی اور مَا عَمَلُکُمْ کے معنی مَعْمُوْلُکُمْ کے ہیں۔ یعنی جو چیز تم بناتے ہو۔

غرض اس آیت کے معنی ہی غلط کئے جاتے ہیں اور خود اس آیت سے پہلی آیت اس کے معنوں کو حل کر دیتی ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں انسان کے اعمال کی پیدائش کا کہیں ذکر نہیں۔

## دوسری آیت کا صحیح مطلب

اس آیت کے سوا یہ لوگ کچھ اور آیات بھی پیش کرتے ہیں جن میں سے ایک دو موٹی موٹی آیتوں کا ذکر میں اس وقت کر دیتا ہوں۔ ایک یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ج هُوَ مَوْلٰنَا ج وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ○ (التوبہ: ۵۱)

کہ ہمیں نہیں پہنچے گا کچھ بھی مگر وہی جو اللہ نے لکھ چھوڑا ہے اللہ تعالیٰ ہی ہمارا مولیٰ ہے اور اسی پر توکل کرتے ہیں مؤمن۔

وہ کہتے ہیں کہ جب خدا کہتا ہے کہ انسان کو وہی ملتا ہے جو پہلے اس کے لئے لکھ چھوڑا گیا ہے۔ اب کھانا دانہ 'کپڑا لتا' روپیہ پیسہ جس قدر خدا نے لکھ چھوڑا ہے کہ اتنا اتنا فلاں کو ملے اس سے زیادہ یا کم نہیں ہو سکتا۔ یا یہ کہ فلاں فلاں کو فلاں طریق سے قتل کرے۔ فلاں فلاں جگہ فلاں کے ہاتھ سے پھانسی پائے۔ تو پھر انسان کا کیا اختیار؟ حالانکہ بات بالکل اور ہے۔ اس جگہ کفار کے ساتھ جنگ کا ذکر خدا تعالیٰ فرماتا ہے اور کہتا ہے کہ جب مسلمانوں کو جنگ سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو منافق لوگ خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے اپنا بندوبست پہلے سے کر رکھا تھا اس لئے ہم اس تکلیف سے بچ گئے۔ مسلمان بیوقوف ہیں کہ اپنے سے طاقتور اور زبردست لوگوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ نادان تم ہو اور اندھے تم ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ مسلمان ہار جائیں گے اور کفار ان پر غلبہ پالیں گے۔ لیکن یہ نہیں ہو گا۔ کیوں؟ اس لئے کہ خدا نے اپنی سنت مقررہ کے ماتحت کہ اس کے رسول ہمیشہ غالب رہیں گے مقدر کر چھوڑا ہے کہ مسلمان جیت جائیں گے۔

پس یہاں ہر ایک عمل خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت سرزد ہونے کا ذکر نہیں بلکہ صرف اس امر کے مقدر ہونے کا ذکر ہے کہ مؤمن کفار پر غلبہ پائیں گے اور جیت جائیں گے۔ نہ یہ کہ ڈاکہ مارنا' چوری کرنا' ٹھگی کرنا' جھوٹ بولنا خدا نے لکھ دیا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ۔ (المجادلة: ۲۲) میں نے مقدر کر دیا ہے کہ میں اور میرے رسول اپنے دشمنوں پر غالب رہیں۔

پس اس آیت میں كَتَبَ سے مراد انسانی اعمال نہیں بلکہ رسول اور مؤمنوں کی فتح مراد ہے۔

## تیسری آیت کا صحیح مطلب

پھر ایک آیت یہ پیش کرتے ہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ز وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○ (الاعراف: ۱۸۰)

فرمایا۔ ہم نے پیدا کر چھوڑے جہنم کے لئے جنوں اور انسانوں میں سے بہت لوگ اور ان کی شناخت کی علامت یہ ہے کہ ان کے دل ہیں مگر سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ اور غافل۔

اس آیت کو لے کر کہتے ہیں کہ دیکھو خدا کہتا ہے کہ میں نے جہنم کے لئے بہت سے جن وانس پیدا کئے ہیں۔ پس جب خدا نے بہت سے لوگوں کو جہنم کے لئے پیدا کیا ہے۔ تو پھر کون ہے جو ان لوگوں کو جنہیں جہنم کے لئے پیدا کیا گیا ہے برے کام کرنے سے روک سکے۔ ضرور ہے کہ وہ ایسے اعمال کریں جو انہیں دوزخ میں لے جائیں۔ لیکن اس آیت کے بھی جو معنی کئے جاتے ہیں وہ غلط ہیں۔ عربی زبان میں لام کا حرف کبھی سبب بتانے کے لئے آتا ہے اور کبھی نتیجہ بتانے کے لئے۔ جسے اصطلاح میں "لَامُ الْعَاقِبَةِ" کہتے ہیں۔ اس جگہ لِجَهَنَّمَ کا جو لام ہے وہ اسی غرض سے ہے اور اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم نے جن وانس کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ ان کو جہنم میں داخل کریں کیونکہ یہ معنی دوسری آیات کے خلاف ہیں۔ جیسا کہ فرمایا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (الذاریٰت : ۵۷) میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور عبد کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ۔ (الفجر : ۳۱) جو عبد ہوتا ہے اس کا مقام جنت ہے۔

پس ان آیات کی موجودگی میں وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ کے یہ معنی ہو ہی نہیں سکتے کہ بہت سے لوگوں کو جہنم کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ انسان کو تو صرف خدا کا عبد بننے اور جنت کا مستحق ہونے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور جب یہ معنی درست نہیں تو پھر اور معنی کرنے پڑیں گے اور وہ یہی ہیں کہ یہاں لام "لَامُ الْعَاقِبَةِ" ہے اور اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا مگر بجائے جنتی بننے کے دوزخ کے مستحق ہو گئے۔ چنانچہ لام ان معنوں میں عربی

زبان میں بکثرت مستعمل ہے اور خود قرآن کریم میں بھی دوسری جگہ ان معنوں میں استعمال ہؤا ہے۔ عربوں کے کلام میں اس کی ایک مثال یہ شعر ہے ؎

اَمْوَالُنَا لِذَوِی الْمِیْرَاثِ نَجْمَعُهَا وَدُوْرُنَا لِخَرَابِ الدَّهْرِ نَبْنِیْهَا

یعنی ہم مال اس لئے جمع کرتے ہیں تا وارث اس کو لے جاویں۔ اور گھر اس لئے بناتے ہیں کہ زمانہ ان کو خراب کردے۔

اب ظاہر ہے کہ مالوں کو جمع کرنے اور گھروں کے بنانے کی یہ غرض نہیں ہوتی۔ ہاں نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ پس شاعر کی یہی مراد ہے کہ لوگ مال جمع کرتے ہیں اور رشتہ دار اس کو لے جاتے ہیں اور گھر بناتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمانہ ان گھروں کو خراب کردیتا ہے۔

قرآن کریم میں ایک نہایت واضح مثال سورہ قصص میں آتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت فرماتا ہے۔

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِیَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا۔ (القصص: ۹)

یعنی حضرت موسیٰؑ کو جب ان کی والدہ نے دریا میں رکھ دیا تو ان کو فرعون کے لوگوں نے اس لئے اٹھالیا کہ وہ بڑا ہو کر ان کا دشمن بنے اور ان کے لئے باعث غم ہو۔

لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ آل فرعون کی موسیٰؑ کے اٹھانے میں یہ نیت نہیں ہوسکتی تھی۔ بلکہ جیسا کہ اگلی آیت ہی میں ہے ان کی یہ نیت نہیں تھی بلکہ اس کے خلاف تھی۔ چنانچہ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فرعون کی بیوی نے فرعون سے کہا کہ۔

عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ۝ (القصص: ۱۰)

یعنی قریب ہے کہ یہ بچہ ہمیں نفع دے یا ہم اسے بیٹا ہی بنالیں۔ لیکن وہ جانتے نہ تھے کہ وہ بڑا ہو کر ان کی تباہی کا موجب ہو گا۔

پس آیت کے یہی معنی ہیں کہ فرعون کے لوگوں نے اس کو اٹھالیا لیکن آخر وہ بچہ ان کا دشمن ہؤا اور ان کے لئے باعث غم ہؤا اور یہی معنی اس جگہ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ میں لام کے ہیں۔

پس اس آیت سے بھی یہ استدلال کرنا کہ خدا تعالیٰ جبراً بعض لوگوں کو دوزخی بناتا ہے اور بعض کو جنتی درست نہیں ہے۔

## چوتھی آیت کا صحیح مطلب

اسی طرح یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ۔

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۝ (یونس:۸۹)

موسیٰؑ نے کہا کہ اے خدا! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو اس لئے دولت دی تھی تاکہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں۔

لیکن اس آیت کا یہ بھی مطلب نہیں کہ ان کو لوگوں کے گمراہ کرنے کے لئے دولت دی گئی تھی بلکہ جیسا کہ پہلی آیت کے متعلق میں بتا آیا ہوں یہاں بھی لام عاقبة کا ہے اور مطلب یہ ہے کہ۔

اے خدا! تُو نے تو اس غرض سے ان کو دولت نہ دی تھی کہ لوگوں کو گمراہ کریں لیکن یہ ایسا ہی کرتے ہیں۔

## پانچویں آیت کا صحیح مطلب

پھر کہتے ہیں ایک آیت نے تو ہمارے مطلب کو بالکل صاف کر دیا۔ اور وہ یہ ہے۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِىْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۤءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝ (النساء:۷۹)

فرمایا۔ جہاں کہیں تم ہو گے وہیں تمہیں موت پہنچ جائے گی۔ خواہ مضبوط برجوں میں ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ان کو بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ محمد (ﷺ) کی طرف سے ہے فرمایا۔ ان کو کہہ دو سب اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ ان کو ہو کیا گیا اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے

کہتے ہیں دیکھو اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ بھلائی برائی خدا کی طرف سے پہنچتی ہے۔ مگر وہ سمجھتے نہیں کہ اول تو ہر ایک فعل کے خواہ برا ہو یا بھلا۔ نتائج اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ملتے ہیں اور اس بات سے کون انکار کرتا ہے کہ ہر ایک فعل کی سزا یا جزاء خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے ملتی ہے لیکن اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ بھلائی اور برائی خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے آتی ہے تو پھر بھی کچھ حرج نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کبھی خادم کے کام کو آقا کی طرف منسوب کر

دیا جاتا ہے خواہ اس کا منشاء اس کام کے متعلق ہو یا نہ ہو۔ مثلاً ایک آقا کا نوکر اگر کسی کو کوئی تکلیف پہنچاتا ہے تو گو آقا کی یہ غرض نہیں ہوتی کہ اس کا نوکر کسی کو تکلیف پہنچائے لیکن بعض دفعہ آقا کو بھی کہہ دیتے ہیں کہ تمہاری طرف سے ہمیں یہ تکلیف پہنچی۔ اور اس طرح نوکر کے تکلیف دینے کو آقا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس قاعدہ کے ماتحت اگر اس آیت کے معنی کئے جاویں تو یہ معنی ہوں گے کہ وہ چیزیں جن کے بد استعمال سے گناہ پیدا ہؤا وہ چونکہ خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں اس لئے خدا تعالیٰ کے متعلق کہہ دیا گیا کہ گویا بدی اور نیکی اسی کی طرف سے آئی ہے۔ اور ان معنوں سے اعمال میں جبر ثابت نہیں ہوتا اور یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا کہ خدا تعالیٰ جبرا پکڑ کر بدی کرواتا ہے بلکہ یہ کہ خدا نے انسان میں بعض طاقتیں پیدا کی ہیں جن کو برے طور پر استعمال کر کے انسان زنا یا چوری کرتا ہے۔

لیکن اصل معنی اس آیت کے وہی ہیں جو میں پہلے بتا چکا ہوں۔ یعنی یہاں اعمال کا ذکر ہی نہیں بلکہ دکھ اور سکھ کا ذکر ہے۔ پہلے تو اللہ تعالیٰ منافقوں سے فرماتا ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو تم کو موت پہنچ جاوے گی۔ یعنی خدا تعالیٰ نے تمہاری بد اعمالیوں کی وجہ سے تمہارے لئے ہلاکت کی سزا تجویز کی ہے۔ اب چونکہ یہ فیصلہ ہو چکا ہے خواہ کتنی بھی احتیاط کرو کچھ نہیں کر سکتے۔ پھر فرماتا ہے کہ یہ لوگ سکھ کو اللہ تعالیٰ کی طرف اور دکھ کو تیری طرف منسوب کرتے ہیں یہ ان کی نادانی ہے۔ تیرا جزاء و سزا میں کیا دخل اور تعلق ہے۔ سکھ اور دکھ بلحاظ نتائج کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے۔ یعنی یہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرماتا ہے کہ فلاں شخص کو فلاں عمل کے بدلہ میں فلاں سکھ یا فلاں دکھ پہنچے تیرا اس میں کیا تعلق ہے۔ یہ تو خدائی طاقت ہے جو اس نے کسی بندے کے اختیار میں نہیں دی۔ اور اس لئے فرماتا ہے کہ ان لوگوں کو کیا ہؤا کہ یہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔ چنانچہ اگلی ہی آیت میں اس کی اور تشریح فرما دی کہ۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۔ (النسا:۸۰)

یعنی جو کچھ سکھ تجھے پہنچتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو دکھ پہنچتا ہے وہ تیری جان کی طرف سے ہے۔

اب اگر پہلی آیت کے یہ معنی لئے جاویں کہ سب اعمال خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو پھر آیت کے کچھ معنی ہی نہیں بن سکتے۔ اس آیت کے معنی تب ہی ہو سکتے ہیں جب کہ پہلی آیت کے وہ معنی کئے جاویں جو میں نے کئے ہیں اور اس صورت میں اس دوسری آیت کے یہ معنی

ہوں گے کہ جو نیک بدلہ ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے کیونکہ نیکی کی تحریک اس کی طرف سے ہوتی ہے اور جو دکھ ہو وہ انسان کی طرف سے ہوتا ہے۔ کیونکہ دکھ غلطی کا نتیجہ ہے اور غلطی کی تحریک اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتی۔

## چھٹی آیت کا صحیح مطلب

پھر کہتے ہیں ایک اور آیت نے تو مطلب بالکل صاف کر دیا ہے اور وہ یہ ہے۔

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِىْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۝

(آل عمران: ۱۵۵)

ان سے کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو تب بھی وہ لوگ جن کے متعلق قتل کا فیصلہ کیا گیا تھا اپنے قتل ہونے کی جگہوں کی طرف نکل کھڑے ہوتے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ خدا ہی کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے اول تو جیسا کہ میں پہلی آیت کے متعلق بیان کر چکا ہوں اس جگہ بھی جزاء کا ذکر ہے اعمال کا ذکر نہیں۔ یہ آیت جنگ احد کے متعلق ہے۔ اس جنگ میں پہلے تو منافق مسلمانوں کے ساتھ جنگ کے لئے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ مگر عین موقع پر ایک ہزار آدمیوں میں سے تین سو آدمی واپس لوٹ آئے اور اس طرح انہوں نے اپنے نزدیک یہ سمجھا کہ ہم مسلمانوں کو دھوکا دے کر جنگ میں پھنسا آئے ہیں کیونکہ دشمن کے سامنے جا کر لوٹنا مشکل ہوتا ہے اور جنگ کے بعد مسلمانوں پر تمسخر اڑانا شروع کیا کہ یونہی تم نے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نادانو! تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ہم ساتھ جا کر مسلمانوں کو پھنسا آئے۔ ہماری مدد کے بھروسہ پر یہ لوگ جنگ کے لئے گئے تھے۔ سو سنو! اگر تم محفوظ قلعوں میں بھی ہوتے یعنی مدینہ جیسا غیر محفوظ مقام تو الگ رہا اگر قلعوں کی حفاظت بھی ہوتی تب بھی وہ لوگ جن پر جنگ فرض کر دی گئی تھی کفار کے مقابلہ میں جنگ کرنے کے لئے نکلنے سے نہ ڈرتے اور ضرور باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کرتے۔

پس اس جگہ كُتِبَ کے معنی مقدر ہونے کے نہیں ہیں بلکہ فرض کئے جانے کے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (البقرۃ: ۱۸۴) تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں اور القتل کے معنی قتل ہونے کے نہیں بلکہ قتل کرنے کے ہیں۔ اور ان معنوں میں یہ لفظ قرآن کریم میں متعدد جگہ آیا ہے۔ جیسے کہ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (البقرۃ: ۱۹۲) اور فَلَا يُسْرِفْ

فِّی الْقَتْلِ (بنی اسرائیل : ۳۴) اور اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيْرًا ۔ (بنی اسرائیل : ۳۲) غرض اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مؤمن تو اللہ تعالیٰ کے احکام کے ماننے میں خوشی پاتا ہے۔ کبھی بھی سستی نہیں دکھاتا۔ مدینہ تو کوئی محفوظ قلعہ نہیں ہے۔ اگر مسلمان باہر نہ جاتے تو کافر یہاں آسکتے تھے۔ اگر قلعوں کی حفاظت ہوتی اور مسلمانوں کو باہر نکل کر حملہ کرنے کا حکم ہوتا۔ تب بھی ان کو یہ بات بری نہ لگتی اور شوق سے اپنے فرض کو ادا کرتے۔

## اس خیال کی تردید کہ خدا کچھ بھی نہیں کرتا

پس ان آیتوں میں سے کسی سے بھی یہ نہیں نکلتا کہ خدا انسان کو مجبور کرا کر اس سے ہر ایک فعل کراتا ہے اور جب یہ نہیں نکلتا تو ان لوگوں کا استدلال جو یہ کہتے ہیں کہ ہر ایک فعل خدا ہی کراتا ہے بالکل باطل ہو گیا۔ اور جو یہ کہتے ہیں کہ خدا کچھ بھی نہیں کرتا اور اس کا کوئی دخل نہیں ہے ان کا عقیدہ بھی قرآن کریم سے ہی غلط ثابت ہوتا ہے مثلاً اس آیت کو لے لو۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ (المجادلة: ۲۲)

کہ میں نے فرض کر دیا ہے کہ میں اور میرے رسول اپنے مخالفین پر غالب ہوں۔

اب دیکھ لو ایک نبی جس وقت دنیا میں آتا ہے اس وقت اس کی حالت دنیوی لحاظ سے بہت کمزور ہوتی ہے لیکن خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ خواہ ساری دنیا بھی اس کے خلاف زور لگائے اس پر غالب نہیں آسکتی۔ چنانچہ آج تک ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ کبھی دنیا خدا تعالیٰ کے کسی رسول پر غالب نہیں آسکی اس سے معلوم ہؤا کہ خدا تعالیٰ کا دخل ہے اور ضرور ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ دنیا رسولوں پر غالب نہیں آسکتی؟ تو یہ خیال بھی غلط ثابت ہو گیا۔

## علم الٰہی اور مسئلہ تقدیر کا خلط

اصل بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے تقدیر کو اس طرح قرار دیا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے خدا ہی کر رہا ہے ہمارا اس میں کچھ دخل نہیں ان کے خیال کی بنیاد گو مسئلہ وحدت الوجود پر ہے لیکن ان کو ایک اور مسئلہ سے ٹھوکر لگی ہے اور اسی نے مسلمانوں کو زیادہ فتنہ میں مبتلاء کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ انہوں نے علم الٰہی اور تقدیر کے مسئلہ کو ایک دوسرے میں خلط کر دیا ہے حالانکہ یہ دونوں مسئلے بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ موٹا ثبوت اس کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا ایک نام علیم اور ایک قدیر ہے۔ اب سوال ہوتا ہے کہ اگر علم الٰہی اور تقدیر ایک ہی بات ہے تو خدا تعالیٰ کے یہ دو نام علیحدہ

علیحدہ کیوں ہیں؟ قدر قدیر سے تعلق رکھتا ہے یعنی قدرت والا اور علم علیم سے تعلق رکھتا ہے یعنی جاننے والا۔ لیکن ان لوگوں نے اس بات کو سمجھا نہیں۔ وہ کہتے ہیں زید جو چوری کرنے چلا ہے۔ خدا کو یہ پتہ تھا یا نہیں کہ زید چوری کرنے جائے گا۔ اگر پتہ تھا اور زید چوری کرنے نہ جائے تو خدا کا علم جھوٹا ہو جائے گا۔ اس لئے معلوم ہؤا کہ زید چوری کرنے کے لئے جانے پر مجبور تھا اور یہ بھی معلوم ہؤا کہ خدا اسے ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو خدا کا علم جھوٹا نکلتا ہے۔ اس ڈھنگ سے یہ لوگ عوام پر قبضہ پالیتے ہیں اور ان سے منوا لیتے ہیں کہ ہر ایک فعل خدا تعالیٰ ہی کرواتا ہے۔ حالانکہ نادان بات کو الٹے طور پر لے جاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں یہ غلط ہے کہ چونکہ خدا کے علم میں تھا کہ زید چوری کرے گا اس لئے وہ چوری کو چھوڑ نہیں سکتا۔ بلکہ بات یہ ہے کہ چونکہ زید نے چوری نہیں چھوڑنی تھی اس لئے خدا کو علم تھا کہ وہ چوری کرے گا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک ایسا آدمی ہمارے پاس آتا ہے جس کی باتوں سے ہمیں پتہ لگ جاتا ہے کہ اس نے فلاں جگہ ڈاکہ مارنا ہے۔ اب کیا اس ہمارے جان لینے سے کوئی عقلمند یہ کہے گا کہ چونکہ ہم نے جان لیا تھا کہ وہ فلاں جگہ ڈاکہ مارے گا اس لئے وہ ڈاکہ مارنے پر مجبور تھا اور ہم نے اس سے ڈاکہ مروایا ہے ہرگز نہیں۔ یہی حال خدا تعالیٰ کے علیم ہونے کا ہے۔ زید نے آج جو کام کرنا تھا بغیر خدا تعالیٰ کے مجبور کرنے کے کرنا تھا لیکن چونکہ خدا تعالیٰ علیم ہے اور ہر بات کا اسے علم ہے اس لئے اس کے متعلق اسے علم تھا کہ زید ایسا کرے گا۔ اسی طرح زید نے چونکہ چوری نہیں چھوڑنی تھی بلکہ کرنی تھی اس لئے خدا تعالیٰ کو علم تھا کہ اس نے چوری کرنی ہے اور جس نے چھوڑنی تھی اس کے متعلق اسے یہ علم ہے کہ وہ چوری چھوڑ دے گا۔ تو خدا تعالیٰ کا علم کسی فعل کے کرنے کا باعث نہیں ہے بلکہ وہ فعل خدا تعالیٰ کے علم کا باعث ہے۔

**مزید توضیح** زمیندار بھائی شاید اس کو نہ سمجھے ہوں اس لئے پھر سناتا ہوں۔ بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ ہر ایک فعل خدا کراتا ہے وہ اس کے ثبوت میں کہتے ہیں کہ خدا کو یہ پتہ تھا یا نہیں کہ عبداللہ فلاں دن چوری کرے گا یا ڈاکہ مارے گا۔ اگر دہریوں کا خیال درست مان لیا جائے کہ خدا نہیں ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ عبداللہ جو کچھ کرے گا اپنی مرضی اور اپنے خیال سے کرے گا۔ لیکن چونکہ خدا ہے اس لئے اس کو پتہ ہے کہ عبداللہ فلاں دن یہ کام کرے گا۔ اگر وہ اس دن وہ کام نہ کرے تو خدا کا علم غلط ٹھہرتا ہے۔ پس خدا اسے مجبور کرتا

ہے کہ وہ اس دن چوری کرے یا ڈاکہ مارے یا زنا کرے۔ ہم کہتے ہیں یہ غلط ہے کہ چونکہ خدا کو علم ہے کہ عبداللہ نے فلاں دن چوری کرنی ہے اس لئے وہ چوری کرتا ہے۔ بلکہ یہ بات ہے کہ چونکہ عبداللہ نے اس دن ایسا کرنا تھا اس لئے یہ بات خدا کے علم میں آئی ہے۔ اگر اس نے چوری نہ کرنی ہوتی اور خدا کے علم میں یہ بات ہوتی کہ اس نے چوری کرنی ہے تو یہ جہل کہلاتا علم نہ کہلاتا۔

پس چور چوری اس لئے نہیں کرتا کہ خدا تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ وہ چوری کرے گا بلکہ خدا تعالیٰ کو اس بات کا علم اس لئے ہؤا کہ چور نے چوری کرنی تھی۔

غرض یہ دھوکا علم اور قدر کے ملا دینے کی وجہ سے لگا ہے لیکن یہ دونوں الگ الگ صفات ہیں اور ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

## خدا تعالیٰ بُرا کام کرنے سے روک کیوں نہیں دیتا

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو جب یہ علم تھا کہ فلاں آدمی فلاں وقت یہ برا کام کرے گا تو اسے روک کیوں نہیں دیتا؟ مثلاً اگر خدا کو علم ہے کہ فلاں شخص چوری کرے گا تو کیوں اس نے چوری کرنے سے اسے روک نہ دیا؟ ہمارے پاس اگر ایک شخص سندر سنگھ ڈاکو آئے اور کہے کہ میں نے فلاں وقت جیون لال کے گھر ڈاکہ مارنا ہے تو اس علم کے باوجود اگر ہم چپ بیٹھے رہیں تو ہم مجرم ہوں گے کہ نہیں؟ یقیناً شرعی' اخلاقی' تمدنی' اور اپنے ملک کے قانون کے لحاظ سے ہم مجرم ہوں گے۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں کوئی اور کام ہو اور ہم جیون لال کو نہ بتا سکیں کہ اس کے گھر فلاں وقت ڈاکہ پڑے گا۔ یا ہو سکتا ہے کہ یہ خطرہ ہو کہ اگر بتایا تو ڈاکو ہمیں مار دیں گے۔ پس جب باوجود اس کے کہ اس ڈاکو کو اپنے ارادہ سے باز رکھنے میں ہمیں خطرات ہیں اگر ہم اس کو باز نہیں رکھتے یا ایسے لوگوں کو اطلاع نہیں دیتے جو اسے باز رکھ سکتے ہیں ہم زیر الزام آجاتے ہیں۔ تو پھر خدا تعالیٰ جو طاقتور اور قدرت والا ہے اس کو کسی کا ڈر نہیں اور کوئی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا' اس پر زیادہ الزام آتا ہے کہ وہ علم رکھنے کے باوجود کیوں ڈاکو کو روک نہیں دیتا یا جس کے گھر ڈاکہ پڑنا ہو اس کو نہیں بتا دیتا تاکہ وہ اپنی حفاظت کا سامان کر لے۔ یہ عجیب بات ہے کہ انسان تو معذور بھی ہو کیونکہ کوئی نہ کوئی وجہ اس کی معذوری کی ہو سکتی ہے وہ باوجود اس کے پکڑا جائے مگر خدا پر باوجود اس کے قادر ہونے کے کوئی الزام نہ آئے؟

یہ اعتراض محض قلت تدبر کا نتیجہ ہے اس لئے کہ خدا تعالیٰ کے متعلق اس مثال کا پیش کرنا ہی غلط ہے۔ اور دنیا میں انسان کی پیدائش کی غرض کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ مثال بنائی گئی ہے۔ خدا کا تعلق جو بندوں سے ہے اس کی صحیح مثال یہ ہے کہ لڑکوں کا امتحان ہو رہا ہے اور سپرنٹنڈنٹ ان کی نگرانی کر رہا ہے اس کے لئے کیا یہ جائز ہے کہ جو لڑکا غلط سوال حل کر رہا ہو اس کو بتا دے؟ نہیں۔ پس جب انسان کو دنیا میں اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ اس کو امتحان میں ڈال کر انعام کا وارث بنایا جائے تو اگر اس کے غلطی کرنے پر اسے بتا دیا جائے کہ تُو فلاں غلطی کر رہا ہے تو پھر امتحان کیسا؟ اور انعام کس کا؟ اس معاملہ میں خدا تعالیٰ کا جو تعلق بندوں سے ہے وہ وہی ہے جو اس سپرنٹنڈنٹ کا ہوتا ہے جو کمرہ امتحان میں پھر رہا ہو اور جو دیکھ رہا ہو کہ لڑکے غلط سوال بھی حل کر رہے ہیں اور صحیح بھی۔ پس باوجود علم کے اللہ تعالیٰ کا بندہ کو فرداً فرداً نہ روکنا اس کی شان کے خلاف نہیں بلکہ اس غرض کے عین مطابق ہے جس غرض کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے۔

## صوفیوں کے فقرے

آج کل کے صوفیوں میں علم اور قدر میں فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے عجیب عجیب قسم کے خیالات پھیلے ہوئے ہیں اور بعض خاص فقرات ہیں جو اس وقت کے صوفیوں کے منہ چڑھے ہوئے ہیں اور جن کو خدا پرستی کی خاص علامت سمجھا جاتا ہے اور جن کے ذریعے سے وہ نادانوں پر اپنا رعب جماتے ہیں مگر عقلمند آدمی ان کے قابو میں نہیں آسکتا۔ چنانچہ میں اس کے متعلق اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں جو ایک لطیفہ سے کم نہیں۔

میں ایک دفعہ لاہور سے آرہا تھا۔ دو تین دوست مجھے سٹیشن پر چھوڑنے آئے۔ یہ ۱۹۱۰ء کا واقعہ ہے۔ جب ہم ریل کے ایک کمرہ میں داخل ہونے لگے تو اس کے آگے کچھ لوگ کھڑے تھے۔ میاں محمد شریف صاحب جو آج کل امرتسر میں ای۔ اے۔ سی ہیں انہوں نے مجھے کہا آپ اس میں نہ بیٹھیں۔ اس میں فلاں پیر صاحب اور ان کے مرید ہیں۔ (یہ پیر صاحب پنجاب کے مشہور پیر ہیں اور اس وقت ہمارے صوبہ کے پیروں میں شاید ان کی گدی سب سے زیادہ چل رہی ہے) شاید کچھ نقصان پہنچائیں۔ اس پر کوئی اور کمرہ تلاش کیا گیا مگر نہ ملا۔ میاں صاحب نے مشورہ دیا کہ سیکنڈ کلاس میں جگہ نہیں انٹر ہی میں بیٹھ جائیں لیکن ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین صاحب بھی ساتھ تھے انہوں نے کہا نہیں اسی کمرہ میں بیٹھنا چاہئے۔ ان لوگوں کا ڈر کیا

ہے۔ میں تو پہلے ہی دل سے یہ چاہتا تھا۔ چنانچہ میں اسی کمرہ میں جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب گاڑی چلنے لگی۔ تو سارے لوگ چلے گئے اور معلوم ہؤا کہ پیر صاحب اکیلے ہی میرے ہمسفر ہیں۔ اسٹیشن پر پیر صاحب سے لوگوں نے دریافت کیا تھا کہ آپ کچھ کھائیں گے تو انہوں نے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ مجھے اس وقت بھوک نہیں۔ میں تو امرتسر جا کر ہی کچھ کھاؤں گا لیکن جونہی گاڑی چلی انہوں نے اس سبز کپڑے کو جو پگڑی پر ڈالا ہؤا تھا اور جس سے منہ کا ایک حصہ ڈھانکا ہؤا تھا اتار دیا۔ اور کھڑکی سے منہ نکال کر اپنے ملازم کو جو نوکروں کے کمرہ میں تھا آواز دی کہ کیا کچھ کھانے کو ہے؟ اس نے جواب دیا کہ کھانے کو تو کچھ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے اس پر اس نے کہا کہ اچھا میاں میر چل کر چائے کا انتظام کروں گا۔ اس پر انہوں نے پوچھا کہ وہ خشک میوہ جو تیرے پاس تھا وہی دے دے۔ چنانچہ اس نے میوہ کا رومال ہاتھ نکال کر پیر صاحب کو پکڑا دیا۔ جو انہوں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ میری طرف مخاطب ہوئے اور پوچھا کہ آپ کی تعریف! میں نے کہا میرا نام محمود احمد ہے۔ پھر کہا آپ کہاں جائیں گے؟ میں نے کہا قادیان۔ اس پر انہوں نے سوال کیا کہ کیا آپ قادیان کے باشندہ ہیں یا صرف قادیان کسی کام جا رہے ہیں؟ میں نے جواب دیا میں قادیان کا باشندہ ہوں۔ اس پر وہ ذرا ہوشیار ہوئے اور پوچھا کہ کیا آپ کو مرزا صاحب سے کچھ تعلق ہے؟ میں نے کہا ہاں! مجھے ان سے تعلق ہے۔ اس پر انہوں نے پوچھا کیا تعلق ہے؟ میں نے جواب دیا کہ میں ان کا بیٹا ہوں۔ اس پر انہوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور کہا اوہو! مجھے آپ سے ملنے کی بہت خوشی ہوئی کیونکہ مجھے مدت سے آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ ان کی یہ بات سن کر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ ان پیر صاحب کو ہمارے سلسلہ سے سخت عداوت ہے اور ان کا فتویٰ ہے کہ جو احمدی سے بات بھی کر جاوے اس کی بیوی کو طلاق ہو جاتی ہے مگر میں خاموش رہا اور اس بات کا منتظر رہا کہ آئندہ کلام کس سمت کا رخ کرتا ہے۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر انہوں نے وہ میوہ کا رومال کھولا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اس بنچ پر آبیٹھے جو میرے اور ان کے بنچ کے درمیان تھا۔ اور رومال کھول کر میرے سامنے بچھا دیا کہ آپ بھی کھائیں۔ چونکہ مجھے کھانسی اور نزلہ کی شکایت تھی۔ میں نے انکار کیا اور کہا کہ مجھے چونکہ گلے میں تکلیف ہے اس لئے آپ مجھے معاف رکھیں۔ پیر صاحب فرمانے لگے کہ نہیں کچھ نہیں ہوتا آپ کھائیں تو سہی۔ میں نے پھر انکار کیا کہ مجھے اس حالت میں ذرا سی بد پرہیزی سے بھی بہت تکلیف ہو جاتی ہے۔ اس پر پیر صاحب

فرمانے لگے کہ ہوتا تو وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کرتا ہے یہ تو باتیں ہیں۔ میں تو اس موقع کا منتظر تھا کہ پیر صاحب اپنے خاص علوم کی طرف آئیں تو مجھے کچھ ان لوگوں کے حالات سے واقفیت ہو۔ میں نے پیر صاحب سے کہا کہ پیر صاحب آپ نے یہ بات بہت بعد میں بتائی۔ اگر آپ لاہور میں بتاتے تو آپ اور میں دونوں نقصان سے بچ جاتے۔ میں نے اور آپ نے ٹکٹ پر روپیہ ضائع کیا۔ اگر آپ کے لئے امرتسر اور میرے لئے قادیان پہنچنا مقدر تھا تو ہم کو اللہ تعالیٰ آپ ہی پہنچا دیتا۔ ٹکٹ پر روپیہ خرچنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس پر پیر صاحب فرمانے لگے کہ نہیں اسباب بھی تو ہیں۔ میں نے کہا انہی اسباب کی رعایت کے ماتحت مجھے بھی عذر تھا۔ اس پر پیر صاحب فرمانے لگے۔ یہی میرا بھی مطلب تھا۔ گو مجھے آج تک سمجھ نہیں آیا کہ ان کا اور میرا مطلب ایک کیوں کر ہو سکتا تھا؟

اس کے علاوہ اور بھی باتیں پیر صاحب سے ہوئیں مگر قدر کے متعلق اسی قدر بات ان سے ہوئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے پیر اس مسئلہ کے متعلق کس قدر غلط خیالات میں مبتلاء ہیں مگر جیسا کہ میں بتا چکا ہوں قرآن کریم کی رو سے یہ خیالات باطل ہیں۔

## بعض لوگوں کے اقوال کا مطلب

ہاں بعض لوگوں کے اقوال ایسے بھی ہیں کہ وہ کہتے ہیں سعی بے فائدہ میں اپنا وقت ضائع نہ کرو جو کچھ ملنا ہے وہ مل رہے گا۔[1]

اس قسم کے اقوال سے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر بات کے لئے سعی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اگر ان کے کلام کا یہی مطلب ہے تو میں پوچھتا ہوں وہ روٹی کھانے کے لئے لقمہ پکڑتے ' منہ میں ڈالتے ' اسے چباتے اور نگلتے تھے یا نہیں؟ پھر وہ سونے کے لئے لیٹتے تھے یا ایک ہی حالت میں دن رات بیٹھے رہتے تھے؟ پھر اگر خدا نے ہر ایک کام کروانا ہے تو ان کے قول کے کیا معنی ہوئے کہ سعی نہ کرو۔ اگر کوئی سعی کرتا ہے تو اس سے سعی بھی خدا ہی کرواتا ہے پھر منع کیوں کیا جائے؟

## صوفیاء کے کلام کا صحیح مطلب

مگر بات یہ ہے کہ ایسے اقوال کا مطلب لوگوں نے سمجھا نہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ بعض لوگ دنیا کے کام میں ایسے منہمک ہوتے ہیں کہ ہر وقت اسی میں لگے رہتے ہیں اور ساری محنت اسی میں لگا دیتے ہیں۔ مثلاً آٹھ نو گھنٹے تو دکان پر بیٹھتے ہیں لیکن جب گھر آتے ہیں تو گھر پر بھی دکان کا ہی حساب

کتاب کرتے رہتے ہیں یا کوئی زمیندار ہے اسے ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ اگر یوں ہو گا تو کیا ہو گا اگر یوں ہو گا تو کیا؟ بزرگوں نے اس قسم کے خیالات سے روکا ہے اور سعی لا حاصل سے منع کیا ہے اور سعی حقیقی سے وہ نہیں روکتے۔ اور سعی لا حاصل یہ ہوتی ہے کہ مثلاً سردی کے موسم میں بستر ساتھ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اب اگر کوئی تیس توشکیں اور دس لحاف لے لے تو ہم کہیں گے یہ فضول ہے ایک بستر لے لینا کافی ہے اسی طرح وہ کہتے ہیں۔ ورنہ اصل اور حقیقی سعی تو وہ خود بھی کرتے ہیں۔

## ایک اور گروہ

ان دو گروہوں کے سوا جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ ایک تیسرا گروہ بھی ہے اس نے اپنی طرف سے درمیانی راستہ اختیار کیا ہے مگر وہ بھی اسلام کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں ہر ایک کام میں تقدیر بھی چلتی ہے اور تدبیر بھی۔ وہ کہتے ہیں ہر ایک چیز میں طاقت خدا نے رکھی ہے۔ مثلاً آگ میں جلانے، پانی میں پیاس بجھانے کی طاقت خدا نے بنائی ہے کسی بندہ نے نہیں بنائی۔ اسی طرح یہ کہ لکڑی آگ میں جلے۔ لوہا، پیتل، چاندی، سونا پگھلے، یہ خدا نے مقدر کیا ہے۔ آگے اس کو گھڑنا اور اس کی کوئی خاص شکل بنانا لوہار یا سنار کا کام ہے جو تدبیر ہے۔ تو ہر چیز میں خدا نے طاقتیں رکھ دی ہیں یہ تقدیر ہے۔ آگے بندہ ان طاقتوں سے کام لیتا ہے یہ تدبیر ہے اور ہر کام میں دونوں باتیں جاری ہیں۔

یہ بات تو ٹھیک ہے مگر چونکہ وہ اسی پر بس کر دیتے ہیں اور اپنے خیالات کا انحصار اسی پر رکھتے ہیں اس لئے ہم کہتے ہیں یہ راستہ بھی ٹھیک راستہ نہیں ہے دراصل جو کچھ ایک سائنس دان کہتا ہے وہی یہ بھی کہتے ہیں۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ سائنس دان بات کو کچھ دور لے جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ چاندی کے پگھلنے کی کیا وجہ ہے؟ وہ کیونکر پگھلتی ہے؟ لیکن آخر میں کہہ دے گا کہ مجھے علم نہیں کہ پھر اس کی کیا وجہ ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ کسی غیر متبدل اور محیطِ کُل قانون کے ماتحت یہ سب کام ہو رہا ہے۔ مگر اس گروہ کے لوگ ابتداء میں تمام کارخانہ عالم کو ایک قانون کی طرف منسوب کر دیتے ہیں جس کو قانون قدرت کہتے ہیں۔

## غلط نام کی وجہ سے دھوکا

میری تحقیق یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے اس مسئلہ کے نام ایسے رکھے ہیں جو غلط ہیں۔ اس لئے اصل مسئلہ مشکل اور مخلوط ہو گیا ہے اور ایسا بہت دفعہ ہوتا ہے کہ غلط نام رکھنے سے دھوکا لگ جاتا ہے مثلاً اگر کسی شخص کا نام نیک بندہ ہو اور کہا جائے کہ فلاں نیک بندہ نے بہت برا کام کیا ہے تو سننے والا حیران

رہ جائے گا کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے اور تعجب کرے گا کہ ایک طرف تو یہ شخص اسے نیک بندہ کہتا ہے اور دوسری طرف اس پر عیب بھی لگاتا ہے تو اگر کسی کا غلط نام بامعنی ہو تو اس سے بہت مغالطہ لگ جاتا ہے ہاں اگر بے معنی نام ہو تو دھوکا نہیں لگتا۔ مثلاً یہ کہیں کہ رلدو نے چوری کی یا ڈاکہ مارا تو کسی کو اس فقرہ پر تعجب نہیں آتا اور اگر کہا جائے رلدو خدا کا پیارا اور نیک بندہ ہے تو بھی کوئی تعجب نہیں آتا۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ فلاں خدا پرست (جو عبداللہ کا ترجمہ ہے) نے شرک کیا تو سخت حیرانی ہوتی ہے۔

**مسئلہ قدر میں غلط نام**

پس بامعنی نام جو غلط طور پر رکھے جاویں ان سے دھوکا لگ جاتا ہے ایسا ہی ان لوگوں کو ہؤا ہے۔ تقدیر کا لفظ تو صحیح ہے لیکن اس کے مقابلہ میں جو نام وہ رکھتے ہیں ان کے معنی بالکل الٹے ہوتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ تقدیر کے بالمقابل انسانی فعل کا نام تدبیر رکھتے ہیں۔ بعض دونوں کا نام جبر اور اختیار رکھتے ہیں حالانکہ یہ دونوں نام غلط ہیں۔ اور ان الفاظ کے معنوں کا اثر اصل مسئلہ پر پڑ گیا ہے اور اس وجہ سے یہ مسئلہ غلط ہو گیا ہے۔

تو پہلی غلطی انہوں نے یہ کی کہ نام غلط رکھا ہے اور صرف یہی نام غلط نہیں بلکہ ان دونوں شقوں کے جس قدر نام انہوں نے رکھے ہیں وہ سب کے سب غلط ہیں۔ مثلاً (۱) تقدیر اور تدبیر (۲) جبر اور اختیار (۳) قدرت قدیمہ و قدرت حادثہ۔ لیکن یہ نام بحیثیت مجموعی پوری طرح تسلی نہیں کرتے۔

**تقدیر کے مقابلہ میں تدبیر غلط ہے**

تقدیر تو ٹھیک ہے لیکن اس کے مقابلہ میں تدبیر انسانی فعل کو کہنا غلط ہے۔ کیونکہ تدبیر خدا بھی کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (السجدۃ:۶)

یعنی اللہ تعالیٰ بعض خاص کاموں کی تدبیر کر کے ان کو زمین کی طرف بھیجتا ہے۔ پھر وہ ایک ایسے وقت میں جس کی مقدار انسانی سالوں کے ایک ہزار سال کے برابر ہوتی ہے اس کی طرف چڑھنا شروع کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تدبیر تو اللہ تعالیٰ بھی کرتا ہے مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ تدبیر وہ ہے

جس میں خدا کا کوئی دخل نہ ہو۔ مگر اس سے بھی زیادہ جبر اور اختیار کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں حالانکہ یہ دونوں لفظ ہی قرآن سے ثابت نہیں ہیں۔ قرآن کریم سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ جبار ہے مگر اس کے معنی اصلاح کرنے والا ہیں اور یہ کہتے ہیں جبریہ ہے کہ زبردستی کام کراتا ہے حالانکہ یہ کسی صورت میں بھی درست نہیں ہے۔ عربی میں جبر کے معنی ٹوٹی ہوئی ہڈی کو درست کرنے کے ہیں اور جب یہ لفظ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ بندوں کے خراب شدہ کاموں کو درست کرنے والا اور اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کے حق کو دبا کر اپنی عزت قائم کرنے والا۔ لیکن یہ معنی تب کئے جاتے ہیں جب بندوں کی نسبت استعمال ہو۔ خدا تعالیٰ کی نسبت استعمال نہیں کئے جاتے اور نہ کئے جاسکتے ہیں کیونکہ سب کچھ خدا تعالیٰ کا ہی ہے۔ یہ کہا ہی نہیں جا سکتا کہ دوسروں کے حقوق کو تلف کر کے اپنی عزت قائم کرتا ہے۔

علاوہ ازیں تدبیر کا لفظ ان معنوں پر پوری روشنی نہیں ڈالتا جن کی طرف اشارہ کرنا اس سے مقصود ہے۔ کیونکہ تدبیر کے معنی عربی زبان میں کسی چیز کو آگے پیچھے کرنے کے ہیں اور مراد اس سے انتظام لیا جاتا ہے۔ لیکن انتظام کا لفظ اس جگہ کچھ بھی نفسِ مسئلہ پر روشنی نہیں ڈالتا۔

اب رہا اختیار۔ اس کے معنی ہیں جو چیز پسند آئے وہ لے لینا۔ پس اگر خدا تعالیٰ نے انسان کو اختیار دے دیا ہے تو جو جس کو اچھا لگا وہ اس نے لیا اور جو عمدہ نظر آیا وہ کیا۔ پھر اس کو کسی فعل پر سزا کیسی؟ تو یہ لفظ بھی غلط ہے۔

**صحیح نام** اصل میں قرآن شریف سے جو الفاظ ثابت ہیں وہ یہ ہیں۔

قدر' تقدیر' قضاء' تدبیر الٰہی

اور ان کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ نے کسب اور اکتساب کے لفظ رکھے ہیں۔

پس قرآن کریم کی رو سے اس مسئلہ کا نام تقدیر الٰہی اور اکتساب یا قدر الٰہی اور کسب یا قضاء الٰہی اور کسب ہو گا۔ اب میں ان ناموں کے ماتحت اس مسئلہ کی تشریح کرتا ہوں۔

اول تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کریم نے تقدیر الٰہی کے مقابلہ میں بندہ کے لئے کسب و اکتساب کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اور یہ لفظ بندہ ہی کے لئے استعمال ہو سکتا ہے خدا تعالیٰ کے لئے نہیں استعمال ہو سکتا ہے کیونکہ کسب کے معنی کسی چیز کی جستجو کرنی اور اس کو محنت سے

حاصل کرنے کے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نہ جستجو کرتا ہے نہ کسی بات کو محنت سے حاصل کرتا ہے۔ ہر چیز اسی کے تابع فرمان ہے اور اس کے ایک ذرا سے اشارہ پر اس کی رضا کو پوری کرنے کے لئے تیار ہے۔ پھر وہ تکلیف سے بالکل پاک ہے وہ کہتا ہے کہ یوں ہو جائے اور اسی طرح ہو جاتا ہے۔ پس اس کے لئے کسب کا لفظ استعمال نہیں ہو سکتا۔ اور اس لفظ کے استعمال سے جو امتیاز قائم ہو گیا ہے وہ اور کسی لفظ سے نہیں ہو سکتا تھا۔

ان الفاظ کی مختصر حقیقت بیان کرنے کے بعد اب میں اس سوال کی طرف آتا ہوں کہ قرآن کریم سے کیا ثابت ہے کہ وہ بندوں سے کس طرح معاملہ کرتا ہے؟ آیا ان کا ہر ایک فعل اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہوتا ہے یعنی صدقہ' خیرات' خوش خلقی' ہمدردی یا چوری' ڈاکہ' ٹھگی سب کچھ خدا ہی کراتا ہے۔ یا یہ کہ بندوں کو اس نے چھوڑ رکھا ہے کہ وہ کمالیں اور جیسا جیسا وہ کمائیں ویسا ویسا بدلہ پائیں۔ قرآن کریم سے دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

## مسئلہ تقدیر پر صرف لفظی ایمان لانا کافی نہیں

لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس مضمون پر کچھ بیان کروں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں نے اس معاملہ میں بڑی بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ انہوں نے خیال کر لیا ہے کہ صرف تقدیر پر ایمان لے آنا کافی ہے۔ حالانکہ اس کے سمجھنے اور جاننے کی ضرورت تھی کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس کو ایمان کی شرط قرار دیا ہے۔ اور جب یہ ایمان کی شرط ہے تو معلوم ہؤا کہ ہمارے لئے مفید بھی ہے ورنہ اس پر ایمان لانا ضروری نہ ٹھہرایا جاتا۔ مثلاً خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ انسان کو اپنے محسن کا علم ہوتا ہے اور اس سے تعلق قائم کرنا جو اس کی ترقی کا موجب ہے اور اس کی پیدائش کی واحد غرض ہے اسی ایمان کے نتیجہ میں حاصل ہو سکتا ہے۔ اور پھر یہ بھی فائدہ ہے کہ اس علم اور ایمان سے انسان سمجھتا ہے کہ ایک ایسی ہستی ہے جس کے سامنے مجھے اپنے اعمال کے متعلق جوابدہی کرنی پڑے گی۔ اسی طرح انبیاءؑ پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ اس کا فائدہ ہے کہ ان کے ذریعہ انسان کو خدا تک پہنچنے کا رستہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح فرشتوں پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ اس کا یہ فائدہ ہے کہ انسان یہ مانتا ہے کہ وہ نیک تحریکیں کرتے ہیں اور پھر ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ان سے تعلق پیدا کر کے ہدایت کے راستہ پر قدم زن ہونے کے لئے مددگار اور دوست پیدا کر لیتا ہے۔ اسی طرح خدا کی کتابوں پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ اس کا یہ

فائدہ ہے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اسے معلوم ہو جاتی ہے اور وہ احکام معلوم ہوتے ہیں جن پر چل کر یہ ہلاکت سے بچ جاتا ہے۔ اسی طرح بعث بعد الموت پر ایمان ہے اس کا یہ فائدہ ہے کہ انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی لغو نہیں بلکہ ہمیشہ جاری رہنے والی ہے اور یہ اس کے لئے کوشش کرتا ہے اسی طرح جتنی باتیں ایسی ہیں جن پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک کا فائدہ ہے مگر تقدیر کے متعلق مسلمانوں نے اس بات کو نہیں سوچا کہ اس پر ایمان لانے کا کیا فائدہ ہے؟ وہ ڈنڈا لے کر کھڑے ہو گئے کہ تقدیر کو مانو۔ اس کا جواب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ آگے کہہ دیا جائے اچھا یہی ہماری تقدیر!

تو مسلمان بجائے اسکے کہ اس مسئلہ کو ماننے کے فائدہ پر غور کرتے بیہودہ باتوں کی طرف چلے گئے۔ حالانکہ انہیں اسی طرف جانا چاہئے تھا کہ تقدیر کے ماننے کا کیا فائدہ ہے؟ اگر اس طرف جاتے تو جو تعریف انہوں نے مسئلہ تقدیر کی کی ہے وہ خود بخود لغو ثابت ہو جاتی اور ان پر واضح ہو جاتا کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں یہ تو بالکل فضول بات ہے اور تقدیر کے مسئلہ کا ماننا فضول نہیں ہو سکتا بلکہ روحانیت سے اس کا بہت بڑا تعلق ہے اور اس سے انسان کو بڑا فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ ایمانیات میں وہی باتیں داخل ہیں جن کا انسان کی روحانیت سے تعلق ہے اور جو روحانیت کی ترقی کا باعث ہیں۔

پس تقدیر کا ماننا جب انسان پر فرض کیا گیا ہے تو معلوم ہؤا کہ روحانیت سے اس کا تعلق ہے اور اس سے روح کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو پھر اس طرف توجہ کرنی چاہئے تھی کہ معلوم کریں وہ کیا فائدہ ہے جو اس سے پہنچتا ہے۔ کیونکہ جب تک اس فائدہ کو معلوم نہ کریں گے اس وقت تک کیا فائدہ اٹھا سکیں گے؟ مگر افسوس فلسفیوں نے قدر اور جبر کی بحثوں میں عمریں ضائع کر دیں اور ایک منٹ کے لئے بھی اس بات کو نہ سوچا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بے فائدہ سر پھٹول کرتے رہے اور اس سے انہوں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ اگر اس امر کو سوچتے اور اس پر عمل کرتے تو ضرور فائدہ اٹھاتے۔ چنانچہ ان فلسفیوں کے مقابلہ میں وہ لوگ جنہوں نے تقدیر کے مسئلہ کے متعلق یقین کر لیا کہ یہ ہماری روحانی ترقی کے لئے ضروری ہے اور پھر اسی پر غور کر کے پتہ لگایا کہ اس کے نہ ماننے کے نقصان کیا ہیں اور ماننے کے فائدے کیا ہیں؟ اور پھر اس علم سے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے تو یہاں تک ترقی کی کہ خدا تعالیٰ تک پہنچ گئے مگر دوسرے لوگ بیٹھے بحثیں کرتے رہے کہ جو فعل ہوتے ہیں وہ ہم کرتے

ہیں یا خدا کرتا ہے۔

غرض اس مسئلہ کے متعلق لغو بحثیں کرنے والوں سے بہت بڑی غلطی ہوئی اور یہ رسول کریم ﷺ کی اس حدیث کے مصداق ہو گئے کہ میری امت میں سے ایک قوم ایسی ہو گی جو قدر کے مسئلہ کی وجہ سے مسخ کی جائے گی۔ (ترمذی ابواب القدر باب الرضاء بالقضاء)

## کیا ہر ایک فعل خدا کراتا ہے؟

اصل بات تو یہ تھی کہ وہ دیکھتے کہ اس مسئلہ کے فوائد کیا ہیں؟ مگر انہوں نے اس کو نہ دیکھا اور ایسے رنگ میں اس مسئلہ کو مانا کہ اس سے بجائے فائدہ کے نقصان اٹھانا پڑا۔ اور اَور بھی جو کوئی ان کی بیان کردہ طرز کو مانے گا نقصان ہی اٹھائے گا۔ مثلاً ان لوگوں میں سے ایک فریق کہتا ہے کہ جو کچھ انسان کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ ہی کراتا ہے۔ اب اگر یہ بات درست ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ ادھر تو ہر ایک برے سے برا فعل خدا کراتا ہے اور ادھر قرآن کریم میں ڈانٹتا ہے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ اب یہ عجیب بات ہے کہ آپ ہی خدا پکڑ کر انسان سے زنا کراتا ہے اور جب کوئی کرتا ہے تو کہتا ہے کیوں کرتے ہو؟ پھر آپ ہی تو ابو جہل کے دل میں ڈالتا ہے کہ محمد (ﷺ) جھوٹا ہے آپ ہی اس کو رسول کریم ﷺ کے مقابلہ میں ہاتھ اٹھانے کے لئے کہتا ہے پھر آپ ہی کہتا ہے اس کو کیا ہو گیا؟ اس کی کیوں عقل ماری گئی؟

ہم کہتے ہیں یہ تو ظلم ہے اور نہ صرف ظلم ہی ہے بلکہ کم عقلی بھی ہے کہ آپ ہی خدا انسان سے ایک برا فعل کرائے اور پھر آپ ہی ڈانٹے۔ اب دیکھو خدا تعالیٰ کے متعلق یہ بات ماننے سے کس قدر نقصان ہو سکتا ہے؟ ایسے عقیدہ کے ساتھ تو ایک منٹ کے لئے بھی انسان کا ایمان قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ تو قدر والوں کا حال ہے۔

## تدبیر والوں کی غلطی

اب رہے تدبیر والے۔ انہوں نے جو تعلیم پیش کی ہے اس کے متعلق اگر وہ خود ہی غور و فکر سے کام لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ انہوں نے ان تعلقات پر جو انسان اور خدا تعالیٰ کے درمیان ہیں تبر رکھ دیا ہے۔ کیونکہ تعلقات کی مضبوطی اور ان میں زیادتی محبت ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ان کی تعلیم اس محبت کو جو انسان اور خدا کے درمیان ہے بالکل مٹا دینے والی ہے۔ تعلقات کس طرح محبت کا باعث ہوتے ہیں اس کے متعلق مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔

ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام "اخبار عام" پڑھ رہے تھے کہ مجھے آواز دی محمود!

محمود ! محمود ! جب میں پاس گیا تو فرمانے لگے کلکتہ کا فلاں شخص مر گیا ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا مجھے کیا؟ فرمایا یہ بے تعلقی کا نتیجہ ہے۔ اس کے گھر تو ماتم پڑا ہو گا اور تُو کہتا ہے مجھے کیا؟

تو تعلق سے محبت پیدا ہوتی ہے مگر تدبیر کے قائل لوگوں کی تعلیم اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اشیاء پیدا کر دیں اور انسان کو پیدا کر دیا۔ اور اس کے بعد اس نے اس کو بالکل چھوڑ دیا کہ جس طرح چاہے کرے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر بندہ اور خدا میں تعلق کیونکر قائم ہو سکتا ہے؟ بے شک جو چیزیں خدا تعالیٰ نے بنائی ہیں ان کے اندر فوائد بھی ہیں مگر ان کے اندر نقصان بھی تو ہیں۔ مثلاً خدا نے آگ بنائی ہے۔ اگر اس کے کچھ فائدے ہیں تو نقصان بھی ہیں۔ اگر اس سے کھانا پکتا ہے تو لاکھوں کروڑوں روپیہ کا سامان اور گھر بھی جلا کر سیاہ راکھ کر دیتی ہے۔

پس ان لوگوں نے تقدیر کے مسئلہ کو اس رنگ میں منوایا کہ ایک تو نعوذ باللہ 'نعوذ باللہ خدا تعالیٰ پر جو تمام عقلوں کا پیدا کرنے والا ہے خلاف عقل کام کرنے کا الزام آتا ہے۔ اور دوسرے خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کا جو محبت کا تعلق ہے وہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ انسان کے دل میں طبعاً خیال پیدا ہوتا ہے کہ مثلاً آگ جو خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہے اگر فائدہ پہنچاتی ہے تو نقصان بھی تو کرتی ہے۔ پھر اس کے پیدا کرنے میں خدا تعالیٰ کا کیا احسان ہؤا؟ یہ خیالات جب پیدا ہوں تو خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلقات محبت نہیں پیدا ہو سکتے بلکہ ایسا ہی تعلق رہ جاتا ہے جیسا کہ یہاں کے لوگوں کو امریکہ والوں سے ہے بلکہ اس سے بھی کم کیونکہ امریکہ سے تو مال بھی منگوا لیا جاتا ہے مگر خدا سے کسی بات کی امید نہیں۔ غرض اس قسم کے خیالات نے روحانیت کو حد سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔

## مسئلہ تقدیر کے متعلق ذوقی باتیں

اب میں اصل مسئلہ کی وہ حقیقت بیان کرتا ہوں جو قرآن کریم سے ثابت ہے۔ پہلے میں اس کی تشریح کروں گا اور پھر اس کے فوائد بتاؤں گا۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ مسئلہ تقدیر کے بعض ایسے پہلو بھی ہیں جن کو بڑے بڑے لوگ بھی بیان نہیں کر سکے اور نہ انہوں نے ان کے بیان کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ بعض ایسی باریک باتیں ہیں جو محض ذوقی ہوتی ہیں۔ ذوقی سے میری مراد وہ نہیں جو عام لوگ کہتے ہیں۔ یعنی جو باتیں بلا دلیل کے ہوں اور ان کی کچھ حقیقت نہ ہو بلکہ میری مراد اس سے وہ امور ہیں کہ جب تک انسان ان کو خود نہ چکھے ان کو معلوم نہیں

کر سکتا۔ پس ان باتوں کو نہ مجھ سے پہلے لوگ بیان کر سکے نہ میں بیان کر سکتا ہوں۔

## تقدیر کی اقسام

تقدیر کے مسئلہ کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ تقدیر کئی قسم کی ہوتی ہے اور ان اقسام میں سے مَیں اس وقت چار قسمیں بیان کروں گا۔ اور وہ چونکہ ایسی ہیں جو عام بندوں سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے لوگ انہیں سمجھ سکتے ہیں اور وہ سمجھائی جا سکتی ہیں۔

ان میں سے ایک کا نام مَیں تقدیر عام طبعی رکھوں گا یعنی وہ جو دنیا کے معاملات میں خدا تعالیٰ کی طرف سے جاری ہے۔ یعنی آگ میں یہ خاصیت ہے کہ جلائے۔ پانی میں یہ خاصیت ہے کہ پیاس بجھائے اور لکڑی میں یہ کہ جلے۔ تاگے میں یہ کہ جب اسے خاص طرز پر کام میں لایا جائے تو کپڑا بُنے۔ روٹی میں یہ کہ پیٹ میں جائے تو پیٹ بھر جائے۔ یہ سب تقدیر ہے جو خدا کی طرف سے جاری ہے۔ انسان کا اس میں دخل نہیں۔ یہ عام ہے اور طبعی معاملات سے تعلق رکھتی ہے۔ روح سے اس کا تعلق نہیں بلکہ جسم سے ہے۔ یا یہ کہ آگ جلانا' انگور کی بیل کو انگور لگنا' کھجور کے درخت کو کھجور لگنا' بعض درختوں کے پیوند کا آپس میں مل جانا' بچہ کا نو ماہ یا ایک خاص مدت میں پیدا ہونا' یہ سب ایسے قانون ہیں جو عام طور پر جاری ہیں ان کا نام مَیں تقدیر عام طبعی رکھتا ہوں۔

دوسری تقدیر خاص طبعی ہے۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے ایک تقدیر عام ہے جیسے کہ قانون مقرر ہے کہ آگ جلائے۔ سورج کی تمازت کے نیچے گرمی محسوس ہو۔ سورج کی گرمی سے پھل پکیں۔ فلاں چیز سے صحت ہو فلاں سے بیماری ہو۔ یہ تو تقدیر عام طبعی ہے۔ لیکن ایک خاص تقدیر طبعی ہے۔ یعنی بعض دفعہ خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام نازل ہوتے ہیں کہ فلاں شخص کو دولت مل جاوے۔ فلاں چیز کو جلا دیا جاوے۔ فلاں شخص کو مار دیا جاوے فلاں کے ہاں بچہ پیدا ہو (خواہ اس کی بیوی بانجھ ہی کیوں نہ ہو) یہ احکام خاص ہوتے ہیں۔ کسی عام طبعی قانون کے ماتحت نہیں ہوتے یعنی ایسے طبعی قانون کے ماتحت نہیں ہوتے جس کا لازمی نتیجہ اسی شکل میں نکلنا ضروری ہے جس شکل میں کہ کسی خاص شخص کے لئے اللہ تعالیٰ کے خاص احکام کے ماتحت ظاہر ہؤا ہے۔

تیسری قسم تقدیر کی تقدیر عام شرعی ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر انسان اس رنگ میں نماز پڑھے تو اس کا یہ نتیجہ ہو اور اس رنگ میں پڑھے تو یہ ہو۔ روزہ رکھے تو یہ خاص روحانی تغیر پیدا ہو۔

چوتھی قسم تقدیر کی تقدیر خاص شرعی ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ خاص طور پر کسی بندہ پر اللہ تعالیٰ فضل کرے جو بطور موہبت ہو جیسے کلام الٰہی کا نزول کہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ (الرحمٰن: ۲-۳)

یہ چار اقسام تقدیر کی ہیں جن کے سمجھانے اور ذہن نشین کرانے کے لئے میں نے الگ الگ نام رکھ دیئے ہیں۔ (۱) تقدیر عام طبعی۔ (۲) تقدیر خاص طبعی (۳) تقدیر عام شرعی (۴) تقدیر خاص شرعی۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ صرف تقدیر عام طبعی جسمانی تعلقات سے ظاہر ہوتی ہے اور دوسری تمام اقسام تقدیر کی خواہ تقدیر خاص طبعی ہو یا تقدیر عام شرعی اور تقدیر خاص شرعی ان سب کا ظہور روحانی تعلقات کی بناء پر ہوتا ہے۔ یعنی ان کے ظہور کا باعث دنیوی اسباب نہیں ہوتے بلکہ وہ روحانی تعلقات جو بندہ کو اللہ تعالیٰ سے ہوتے ہیں یا جو اللہ تعالیٰ کو بندہ سے ہوتے ہیں۔ پس یہ تقدیر یا مؤمنوں کی ترقی کے لئے ظاہر ہوتی ہے یا کافروں کی ذلت کے لئے یا عام لوگوں کے لئے بطور رحم کے۔

تقدیر کی ان اقسام کے سوا کوئی ایسی قسم تقدیر کی نہیں ہے جو انسان کو مجبور کرتی ہے کہ چوری کرے' ڈاکہ مارے' زنا کرے' وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ خدا مجبوراً ایسا کراتا ہے وہ جھوٹ کہتے ہیں اور خدا تعالیٰ پر الزام لگاتے ہیں۔

### تقدیر کا ظہور

یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ تقدیر کی کس قدر اقسام ہیں اس بات کا معلوم کرنا ضروری ہے کہ خاص تقدیر کے ظہور کے اسباب کیا ہوتے ہیں؟ اس بات کے نہ سمجھنے کے باعث سے ہی بعض لوگ یہ کہنے لگ گئے ہیں کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں خدا کراتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ خدا تعالیٰ ہر ایک شخص سے جبراً کام نہیں کراتا۔ خدا تعالیٰ کی خاص تقدیر کے نزول کے لئے خاص شرائط ہیں۔ درحقیقت یہ دھوکا عُجب سے پیدا ہؤا ہے۔ ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم بھی کچھ ہیں جن سے خدا کام کراتا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے خاص حکم خاص ہی لوگوں کے لئے ہوتے ہیں خواہ وہ خاص طور پر نیک ہوں خواہ وہ خاص طور پر بد۔

## تقدیر خاص کی تفصیل

مختصر طور پر تقدیر کی اقسام بیان کرنے کے بعد اب میں کسی قدر ان کی تفصیل بیان کرتا ہوں لیکن چونکہ تقدیر عام خاص قواعد کے ماتحت ہوتی ہے اس لئے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں تقدیر خاص کی ہی تفصیل بیان کرنی کافی ہوگی۔

تقدیر خاص دو قسم کی ہوتی ہے۔ بعض اصولی قواعد کے ماتحت خدا تعالیٰ کی طرف سے احکام جاری ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ ایک قاعدہ خدا تعالیٰ نے مقرر کر چھوڑا ہے کہ نبی اور نبی کی جماعت اپنے دشمنوں پر غالب آئے گی۔ چنانچہ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ (المجادلة:۲۲)

اللہ تعالیٰ نے فرض کر چھوڑا ہے کہ میں اور میرے رسول دشمنوں پر غالب آئیں گے۔ اور فرماتا ہے۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (الروم:۴۸)

یہ ہم پر فرض ہے کہ ہم مؤمنوں کی مدد کریں۔

اب جب کہ انبیاءؑ اور ان کی جماعتوں کو اپنے دشمنوں پر فتح ہوتی ہے تو اس کو عام شرعی تقدیر کے ماتحت نہیں لا سکتے کیونکہ یہ خاص حکم ہے جو ایک خاص اصل کے ماتحت جاری ہوتا ہے اور بسا اوقات امور طبعیہ اس کے مخالف پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ دوم وہ تقدیر خاص کہ وہ خاص خاص حالات اور خاص اشخاص کے لئے جاری ہوتی ہے اور کسی اصولی قاعدہ کے ماتحت نہیں ہوتی۔ اس کی مثال وہ وعدہ ہے جو رسول کریم ﷺ سے فتح مکہ کے متعلق کیا گیا۔ رسول کریم ﷺ کے لئے یہ بات تو عام قانون کی رو سے ہی مقدر تھی کہ آپؐ دشمنوں پر غالب ہوں مگر خدا تعالیٰ نے یہ قانون نہیں بنایا کہ جہاں کوئی نبی پیدا ہو وہاں وہ بادشاہ بھی ہو جائے مگر رسول کریم ﷺ کے لئے یہ خاص حکم جاری کیا گیا کہ آپؐ اول مکہ سے ہجرت کریں اور پھر اس کو فتح کر کے وہاں کے بادشاہ بنیں۔ یہ خاص رسول کریم ﷺ کے لئے حکم تھا اور ایسا حکم تھا کہ جب یہ جاری ہو گیا تو خواہ دنیا کچھ کرتی اور ساری دنیا آپؐ کو مکہ کا بادشاہ بننے سے روکنا چاہتی نہ روک سکتی۔ نادان کہتے ہیں کہ چوری خدا کراتا ہے۔ ہم کہتے ہیں چوری تو ایسا فعل ہے کہ اس سے لوگ روک بھی سکتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ جو کچھ کراتا ہے اس کو کوئی نہیں روک سکتا۔ رسول کریم ﷺ کو مکہ میں وحی ہوئی۔

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ (القصص:۸۶)
یعنی وہ پاک ذات جس نے تجھ پر قرآن نازل کیا ہے ضرور تجھے مکہ میں پھر لوٹانے والا ہے۔
اس میں دو پیشگوئیاں تھیں۔ اول یہ کہ مکہ سے نکلنا پڑے گا اور دوسری یہ کہ پھر واپس آنا ہو گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہؤا اور کوئی اس میں روک نہ بن سکا۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے یہ تقدیر خاص جاری ہوئی کہ ان کے دشمن کے سارے پلوٹھے مارے جائیں گے۔ تو یہ عام تقدیر تھی کہ انبیاءؑ غالب ہوں گے مگر یہ کہ فلاں کس طرح غالب ہو گا اور فلاں کس طرح۔ یہ خاص تقدیر تھی۔

اسی طرح حضرت صاحبؑ سے خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قادیان کی ترقی ہوگی اور حضرت صاحبؑ نے لکھا ہے کہ دس دس میل تک اس کی آبادی پھیل جائے گی اور آپ جانتے ہیں کہ آج جہاں لیکچر ہو رہا ہے یہ جگہ اس جگہ سے جہاں پہلے لیکچر ہوتے تھے قریباً ایک میل پرے ہے تو نبیوں کا جیتنا اور غالب ہونا ایک عام تقدیر ہے جو بعض اصولی قواعد کے ماتحت جاری ہوتی ہے مگر ان کے جیتنے کا طریق ایک خاص تقدیر ہے جو ہر زمانہ کے حالات سے متعلق ہے وہ کسی ایک قاعدہ کے ماتحت جاری نہیں ہوتی۔ مثلاً حکم ہو گیا کہ حضرت مرزا صاحبؑ جس جگہ میں رہتے تھے اس کو بڑھا دیا جائے۔ اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ آج کل بڑے بڑے شہروں کا رواج ہو رہا ہے اور بڑے شہر دنیا کا فیشن ہو گئے ہیں۔ سو اس زمانہ کے لئے خدا تعالیٰ نے یہی تقدیر خاص ظاہر کی ہے۔

## تقدیر کا تعلق اسباب سے

اب میں بتاتا ہوں کہ تقدیر جاری کس طرح ہوتی ہے۔ کیا خدا ایک شخص کی نسبت کہتا ہے کہ جل جائے تو وہ کھڑے کھڑے جل جاتا ہے اور وہیں اس کو آگ لگ جاتی ہے یا اس کے لئے کچھ سامان پیدا ہوتے ہیں؟

اس کے لئے یاد رکھنا چاہئے کہ تقدیر اور اسباب کا تعلق بھی کئی طرح ہوتا ہے۔

(ا) تقدیر اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ اسباب شامل ہوتے ہیں۔ تقدیر عام طبعی ہمیشہ اسی طرح ظاہر ہوتی ہے جیسے آگ کا لگنا۔ آگ جب لگے گی انہی سامان کی موجودگی میں لگے گی جن کے اندر خدا تعالیٰ نے یہ خاصہ پیدا کیا ہے کہ وہ آگ پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آگ کی چنگاری کسی ایسی چیز کو لگ جاوے جو جلنے کی قابلیت رکھتی ہے یا یہ کہ دو ایسی چیزوں میں

کہ جو دونوں یا دونوں میں سے ایک جلنے کے قابل ہو رگڑ پیدا ہو کر آگ نکل آوے یا دو سخت رگڑنے والی چیزوں کے پاس کوئی ایسی شَے ہو جو جلنے کی قابلیت رکھتی ہے۔ تقدیر خاص دو طرح ظاہر ہوتی ہے۔

(ا) (الف) تو اسی طرح کہ اسباب اس کے ساتھ ہوں۔

(ب) اس طرح کہ اسباب اس کے ساتھ نہ ہوں۔

وہ تقدیر خاص جس کے ساتھ اسباب شامل ہوتے ہیں آگے کئی طرح ظاہر ہوتی ہے۔

-i- یہ کہ اسباب نظر آتے ہیں اور پتہ لگ جاتا ہے کہ اس امر کے یہ اسباب ہیں اور ان میں تقدیر کا پہلو بہت مخفی ہوتا ہے۔ یہ آگے پھر کئی طرح ظاہر ہوتی ہے۔

-ii- اسباب بد کے مقابلہ میں اسباب نیک پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کسی گاؤں میں تھا جہاں کے نمبردار نے مخالفت کی وجہ سے اسے تکلیف دینی شروع کی۔ اب خدا نے کسی وجہ سے (وہ وجہ کیا ہے اس کے متعلق آگے بیان کروں گا) یہ فیصلہ کیا کہ اس بندہ کو تکلیف نہ پہنچے۔ اس کے لئے ایک طریق یہ ہے کہ تحصیلدار کے دل میں خدا تعالیٰ اس کی محبت ڈال دے اور وہ اس سے دوستانہ میل ملاقات شروع کر دے۔ یہ دیکھ کر نمبردار خود بخود اس کی مخالفت سے باز آجائے گا کہ اس کا تو تحصیلدار سے تعلق ہے کہیں مجھ پر مقدمہ نہ دائر کر دے۔

(۲) یہ کہ جو اسباب بد ہوتے ہیں وہ نیک ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کا کوئی مخالف اس سے دشمنی کرتا ہے اور اسے نقصان پہنچانا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ ایسے اسباب پیدا کر دے کہ وہ مخالف دوست بن جائے جیسا کہ حضرت صاحبؑ کے ساتھ ہنری مارٹن کلارک کے مقدمہ کے وقت ہؤا ہے۔ جس نے آپ کے خلاف سازش کا مقدمہ دائر کروا دیا تھا جب یہ مقدمہ ہؤا ہے اس وقت ضلع گورداسپور کے ڈپٹی کمشنر کپتان ڈگلس صاحب تھے۔ یہ صاحب شروع شروع میں سخت متعصب تھے اور گورداسپور آتے ہی انہوں نے کئی لوگوں سے سوال کیا تھا کہ ایک شخص یہاں مسیحیت اور مہدویت کا دعویٰ کرتا ہے کیا اس کا ابھی تک کوئی انتظام نہیں کیا گیا؟ ایسے شخص کو تو سزا ہونی چاہئے تھی کیونکہ ایسا دعویٰ مُخِلِّ امن ہے۔ چونکہ یہ مقدمہ خاص اہمیت رکھتا تھا اس لئے انہی کی عدالت میں پیش ہؤا۔ اور انہوں نے اپنے مخفی تعصب کے ماتحت جو پہلے سے ان کو تھا پہلے حکم دینا چاہا کہ بذریعہ وارنٹ حضرت صاحبؑ کو گرفتار کرا کے منگوایا جاوے۔ مگر پولیس افسران نے اور ان کے عملہ کے آدمیوں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ ایک

بڑی اور معزز جماعت کے لیڈر ہیں۔ ان سے اس طرح کا سلوک فتنہ پیدا کرے گا۔ پہلے پیشی پر ان کو یونہی بلوایا جاوے پھر مقدمہ کے حالات دیکھ کر آپ جو حکم چاہیں دیں۔ اس پر انہی لوگوں کے مشورہ سے ایک پولیس افسر کو حضرت صاحبؑ کے بلانے کیلئے بھیج دیا گیا اور وہ آکر اپنے ساتھ حضرت صاحب کو لے گیا۔ لیکن وہی افسر جو کہتا تھا کہ ابھی تک مرزا صاحبؑ کو سزا کیوں نہیں دی گئی خدا تعالیٰ نے اس کے دل پر ایسا تصرف کیا کہ اس کے اندر کچھ عجیب تغیر پیدا ہوگیا اور اس نے ڈائس پر کرسی بچھا کر حضرت صاحبؑ کو اپنے ساتھ بٹھوایا اور جب آپؑ عدالت میں پہنچے تو کھڑے ہو کر اس نے مصافحہ کیا اور خاص عزت سے پیش آیا۔ شاید کوئی کہہ دے کہ بعض چالاک انسان ظاہر میں اس لئے محبت سے پیش آتے ہیں کہ آخر نقصان پہنچائیں اسی لئے اس نے اس طرح کیا۔ لیکن آگے دیکھئے جب مقدمہ شروع ہؤا تو باوجود اس کے کہ مقابلہ میں انگریز پادری تھا اور مقدمہ کوئی معمولی نہیں بلکہ قتل کا مقدمہ تھا اور وہ بھی مذہبی گواہ موجود تھے ملزم مُقِرّ تھا مگر اس نے بیان سن سنا کر کہہ دیا کہ میرا دل گواہی نہیں دیتا کہ یہ مقدمہ سچا ہو۔ اب بتاؤ دل پر کون حکومت کر رہا تھا وہی جس کا نام خدا ہے۔ ورنہ اگر کپتان ڈگلس صاحب کا اپنا فیصلہ ہوتا تو ظاہر پر ہوتا۔ مگر ظاہری تمام حالات کو خلاف پا کر بھی وہ کپتان پولیس کو کہتے ہیں کہ جاؤ اس ملزم سے پوچھو حقیقت کیا ہے؟ وہ آکر کہتے ہیں کہ ملزم بیان دیتا ہے کہ جو کچھ میں کہہ چکا ہوں وہی صحیح ہے۔ اس پر بھی کپتان ڈگلس کہتے ہیں میرا دل نہیں مانتا۔ پھر کپتان پولیس جاتے ہیں اور وہ پھر یہی کہتا ہے مگر ادھر یہی جواب ہے کہ دل نہیں مانتا۔ اس پر کپتان پولیس کو بھی خاص خیال پیدا ہؤا اور انہوں نے یہ سوال کیا کہ ملزم کو بجائے پادریوں کے پاس رکھنے کے پولیس کی حراست میں لیا جائے تاکہ سازش کا شبہ نہ رہے۔ اور جب اس پر عمل کیا گیا تو ملزم فوراً صاحب کے پاؤں پر گر پڑا اور اس نے سب حقیقت بیان کر دی اور بتا دیا کہ مجھے فلاں پادری سکھایا کرتے تھے اور بعض احمدیوں کے نام جن کو یہ ساتھ پھنسانا چاہتے تھے جب مجھے یاد نہ رہتے تھے تو یہ میری ہتھیلی پر پنسل سے وہ نام لکھ دیتے تھے تا عدالت میں مَیں ہتھیلی کو دیکھ کر اپنی یاد تازہ کرلوں۔ اس طرح ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے خود ایک مجرم کے دل کو پھیر کر اس کے مونہہ سے حق کہلوا دیا اور دوسری طرف خود ڈپٹی کمشنر کے دل کو پھیر دیا۔ جو پہلے مخالف تھا موافق ہوگیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ حضرت صاحبؑ بالکل بری ہیں اور کہا کہ اگر آپؑ چاہیں تو ان لوگوں پر جنہوں نے آپؑ کے خلاف منصوبہ کیا تھا مقدمہ کر

سکتے ہیں۔ یہ تقدیر خاص تھی مگر کس طرح ظاہر ہوئی۔ اس طرح کہ جو اسباب بد تھے ان کو خدا تعالیٰ نے نیک کر دیا۔ اور جو سزا دینے کا ارادہ رکھتا تھا اسی نے کہا کہ میرا دل نہیں مانتا کہ مرزا صاحب پر یہ الزام سچائی سے لگایا گیا ہو۔

(۳) تیسرا طریق تقدیر کے جاری ہونے کا یہ ہے کہ اسباب بد کے بد اثر سے اسباب ہی پیدا کرکے اسے بچا دیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی کو قتل کرنے کے لئے اس کے گھر آتا ہے اور اس پر تلوار بھی چلاتا ہے۔ اور تلوار اس پر پڑتی بھی ہے مگر اُچٹ جاتی ہے اور ٹھیک طور پر لگتی ہی نہیں یا درمیان میں کوئی اور چیز آجاتی ہے اور وہ اس کے اثر سے محفوظ رہتا ہے۔ اس واقعہ میں اسباب تو بد ہی رہے۔ نیک نہیں ہوگئے۔ مگر ان کے اثر سے انسان بچ گیا۔

(۴) چوتھے تقدیر اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ اسباب بد کے مقابلہ میں سعی نیک کی توفیق مل جاتی ہے۔ مثلاً دشمن حملہ کرتا ہے۔ اس کے حملہ سے بچنے کا ایک تو یہ ذریعہ تھا جو میں پہلے بتا چکا ہوں کہ خدا تعالیٰ کسی اور طاقتور انسان کو اس کی حفاظت کے لئے کھڑا کر دیتا ہے اور دوسرا طریق یہ ہے کہ خود اسی کو اس کے مقابلہ کی طاقت عطا کر دیتا ہے اور اسی طرح سعی نیک کی توفیق دے کر ان بد اسباب کے اثر سے اسے بچا لیتا ہے جو اس کے خلاف جمع ہو رہے تھے۔

یہ چار طریق ہیں جن میں تقدیر خاص اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ اسباب کے ذریعہ ہی سے تقدیر عام کو ٹلایا جاتا ہے اور اسباب نظر بھی آتے ہیں۔

## تقدیر کے ساتھ مخفی اسباب

دوسری صورت تقدیر کے ظاہر ہونے کی یہ ہے کہ اس کے لئے اسباب پیدا تو کئے جاتے ہیں لیکن وہ بہت مخفی ہوتے ہیں اور جب تک اللہ تعالیٰ نہ بتائے یا بہت غور نہ کیا جاوے ان کا پتہ نہیں لگتا اور اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بلا اسباب کے ظاہر ہوئی ہے۔ مگر درحقیقت اس کا ظہور اسباب کی مدد سے ہی ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی کا دشمن ہو اور اس کو ہر طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا ہو کسی وقت اسے اتفاقاً ایسا موقع مل جائے کہ وہ چاہے تو اسے ہلاک کر دے۔ لیکن باوجود دیرینہ خواہش کے وہ اس وقت اپنے دشمن کو چھوڑ دے۔ اب بظاہر تو یہ سلوک اس شخص کا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی سبب ظاہر نہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ سبب موجود ہو۔ مثلاً یہ کہ ڈر غالب آگیا ہو کہ کوئی مجھے دیکھتا نہ ہو۔ یا یہ کہ اس کے رشتہ داروں کو شک گزر گیا تو وہ مجھ سے بدلہ لیں گے یا اور کوئی ایسا ہی سبب ہو جو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر پیدا کر دیا ہو۔

چنانچہ قرآن کریم میں اس کی ایک مثال موجود ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کے مخالفین کہتے ہیں۔

وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (ھود: ۹۲)

یعنی اگر تیری جماعت نہ ہوتی تو ہم تجھے ضرور رجم کر دیتے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود خواہش کے حضرت شعیبؑ کو رجم نہیں کرتے تھے کیونکہ ڈرتے تھے کہ آپؑ کے رشتہ دار ناراض ہو کر بدلہ لیں گے۔ لیکن جب تک انہوں نے خود اس بات کو ظاہر نہیں کیا لوگوں کو تعجب ہی ہوتا ہوگا کہ کیوں یہ لوگ جوش دکھا کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے ظاہر کرنے سے معلوم ہؤا کہ یہ تقدیر بھی ایک خاص سبب کے ذریعہ ظاہر ہو رہی تھی۔ اس جگہ یہ شبہ نہیں کرنا چاہئے کہ یہ تقدیر خاص کیونکر ہوگئی۔ جس کے رشتہ دار زیادہ ہوتے ہیں لوگ اس سے ڈرتے ہی ہیں۔ کیونکہ یہ جو کچھ ہؤا عام قانون قدرت کے ماتحت نہیں ہؤا بلکہ تقدیر خاص کے ماتحت ہی ہؤا۔ کیونکہ حضرت شعیبؑ کا دعویٰ تھا کہ وہ نبی ہیں اور اس دعویٰ کے ساتھ ہی انہوں نے دنیا کو بہانگ دہل کہہ دیا تھا کہ وہ کامیاب ہوں گے اور ان کا دشمن ان پر قدرت نہیں پا سکے گا۔ پس ان کے دشمن کا ان پر قدرت نہ پانا عام قانون قدرت کا نتیجہ نہیں کہلا سکتا بلکہ یہ خاص تقدیر تھی اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ دشمنوں کے ہاتھ کو روک رہا تھا۔ خصوصاً جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت شعیبؑ کے رشتہ دار خود دشمنوں کے ساتھ ہی تھے اور ان کے مرید نہ تھے۔ اور یہ بھی کہ بہت دفعہ بڑے بڑے بادشاہوں کو لوگ قتل کر دیتے ہیں اور کسی سے نہیں ڈرتے تو اور بھی روشن ہو جاتا ہے کہ یہ تقدیر خاص ہی تھی۔

اس قسم کی تقدیر کی مثال رسول کریم ﷺ کی زندگی میں جنگ احزاب میں ملتی ہے۔ جنگ احزاب کے وقت آپؐ کے دشمنوں نے بڑے زور شور سے حملہ کی تیاری کی تھی۔ مگر باوجود ان کی تمام کوششوں کے ان سے کچھ نہ بنا۔ وہ اس موقع پر دس ہزار کا لشکر لائے تھے اور ایسی خطرناک صورت ہوگئی تھی کہ مسلمانوں کے لئے باہر نکل کر پاخانہ پھرنے کی بھی جگہ نہ رہی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اس وقت کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ

بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا○ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا○ وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا○
(الاحزاب:۱۰تا۱۳)

یعنی اے مؤمنو! اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو جب کہ بہت سے لشکر تم پر حملہ آور ہوئے۔ پس ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے لشکر بھیجے جن کو تم نہیں دیکھتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھتا تھا۔ ہاں یاد کرو! جب کہ دشمن تمہارے اوپر کی طرف سے بھی اور نیچے کی طرف سے بھی آگیا اور جب کہ تمہاری نظریں کج ہوگئیں اور دل خوف کے مارے مونہہ کو آتے تھے اور تم اللہ تعالیٰ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس موقع پر مؤمنوں کی سخت آزمائش ہوئی اور وہ خوب ہلائے گئے۔ اور یاد کرو! جب کہ منافق اور روحانی بیمار بھی باوجود اپنی بزدلی کے کہہ اٹھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے صرف جھوٹا وعدہ کیا تھا۔

اس آیت سے ثابت ہے کہ غزوہ احزاب کے وقت اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی ایسے سامانوں سے مدد کی تھی جن کو وہ نہیں دیکھتے تھے اور ایسی حالت میں مدد کی تھی جب کہ منافق جو طبعاً ڈرپوک ہوتا ہے مسلمانوں کی جاتی طاقت کو دیکھ کر دلیر ہوگیا تھا اور کہنے لگ گیا تھا کہ مسلمانوں کے خدا اور ان کے رسول ہم سے جھوٹ بولتے رہے تھے۔

غزوہ احزاب میں ایسے مخفی ذرائع سے خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کی تھی کہ خود مسلمان حیران رہ گئے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ عین ان دنوں میں جب کہ دشمن اپنے زور پر تھا اور مسلمانوں کا احاطہ کئے ہوئے تھا ایک روز رات کے وقت رسول کریم ﷺ نے آواز دی کہ کوئی ہے؟ ایک صحابیؓ نے کہا۔ میں حاضر ہوں۔ آپؐ نے فرمایا تم نہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد آواز دی۔ پھر وہی صحابیؓ بولے کہ حضور میں حاضر ہوں۔ آپؐ نے فرمایا تم نہیں کوئی اور۔ پھر آپ تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا کہ کوئی ہے؟ اسی صحابیؓ نے جواب دیا[مہ]۔ آپؐ نے فرمایا کہ خدا نے مجھے خبر دی ہے کہ دشمن بھگا دیا گیا۔ تم جا کر دیکھو اس کی کیا حالت ہے۔ وہ جب گیا تو دیکھا کہ صاف میدان پڑا ہے اور دشمن بھاگ گیا ہے[★]۔ بعض صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم اس وقت جاگ رہے تھے مگر شدت سردی سے بولنے کی طاقت نہ پاتے تھے۔

اب بظاہر دشمن کے بھاگنے کے کوئی اسباب نظر نہیں آتے اور اس وقت صحابہؓ بھی حیران تھے۔ مگر جیسا کہ بعد میں بعض لوگوں کے اسلام لانے سے ثابت ہؤا اس کے بھی اسباب تھے مگر

مہ بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ خندق ★ الخصائص الکبریٰ مؤلفہ جلال الدین عبدالرحمان بن ابی بکر السیوطی جلد ا صفحہ ۲۳۰ پر ذکر ہے کہ حضرت حذیفہ دشمن کی خبر لانے کے لئے گئے تھے۔

بہت مخفی اور وہ یہ کہ دشمن اچھے بھلے رات کو سوئے تھے کہ ایک قبیلہ کے سردار کی آگ بجھ گئی۔ عرب میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ جس کی آگ بجھ جائے اس پر مصیبت آتی ہے۔ اس سردار کے قبیلہ نے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ آخر یہ صلاح ہوئی کہ ہم اپنا خیمہ اکھاڑ کر کچھ دور پیچھے جا لگائیں اور کل پھر لشکر میں آملیں گے۔ یہ صلاح کر کے جب وہ پیچھے جانے لگے تو ان کو دیکھ کر دوسرے قبیلہ نے اور ان کو دیکھ کر تیسرے نے حتیٰ کہ اس طرح سب نے واپس جانا شروع کر دیا اور ہر ایک نے یہ سمجھا کہ دشمن نے شبخون مارا ہے۔ یہ سمجھ کر ہر ایک نے بھاگنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ابو سفیان جو لشکر کا سردار تھا وہ سراسیمگی کی حالت میں بندھی ہوئی اونٹنی پر سوار ہو کر اسے مارنے لگ گیا کہ چلے۔ جب سب بھاگ گئے اور آگے جا کر ایک دوسرے سے پوچھا تو انہیں معلوم ہؤا کہ یونہی بھاگ آئے ہیں۔

غرض احزاب کے بھاگنے کے اسباب تو موجود تھے مگر نظر آنے والے نہیں تھے بلکہ مخفی تھے۔ قرآن کریم میں یہی تشریح آئی ہے کہ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا۔ ایسے لشکر جو نظر نہیں آتے تھے اور مخفی تھے۔

ادھر رسول اللہ ﷺ کے کسی اور کو بلانے کی وجہ کیا تھی؟ یہ کہ آپ مسلمانوں کو بتائیں کہ خدا ہی ہے جو تمہیں کامیابی دیتا ہے ورنہ تمہاری تو یہ حالت ہے کہ سردی کے مارے زبانیں اس قدر خشک ہو گئی ہیں کہ محمد (ﷺ) بلاتا ہے اور تم اس کی آواز کا جواب نہیں دے سکتے۔ ادھر خدا کی یہ قدرت نمائی ہے کہ اس نے تمہارے اتنے بڑے دشمن کو بھگا دیا ہے۔

## تقدیر خاص بلا اسباب

اس تقدیر خاص کے علاوہ جس کے ظہور کے لئے اللہ تعالیٰ اسباب پیدا فرماتا ہے ایک تقدیر وہ بھی ہے جو بلا اسباب کے ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔

(ا) اول وہ تقدیر جس کا ظہور درحقیقت بلا اسباب کے ہی ہوتا ہے۔ مگر کسی خاص حکمت کے ماتحت اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ اسباب کو بھی شامل کر دیتا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ حضرت صاحبؑ کو الہام ہؤا کہ احمدیوں کو بالعموم طاعون نہیں ہوگی۔ مگر اس کے ساتھ ہی آپؑ نے یہ بھی کہا کہ جرابیں پہنیں، شام کے بعد باہر نہ نکلیں اور کونین استعمال کریں یہ اسباب تھے۔ مگر حقیقی بات یہی ہے کہ یہ تقدیر بغیر اسباب کے تھی۔

کیونکہ جرابیں اور دستانے زیادہ پہننے والے تو اور لوگ بھی تھے۔ پھر زیادہ دوائیاں استعمال کرنے والے بھی اور لوگ تھے۔ احمدیوں کے پاس کوئی زیادہ اسباب نہ تھے کہ وہ طاعون سے محفوظ رہتے۔ دراصل جرمز (GERMS) کو حکم تھا کہ احمدیوں کے جسم میں مت داخل ہوں۔ مگر ساتھ ہی احمدیوں کو بھی حکم تھا کہ اسباب کو اختیار کرو۔ وجہ یہ کہ یہ حکم دشمن کے سامنے بھی جاتا تھا اور ایمان اور عدم ایمان میں فرق نہ رہ جاتا۔ اگر بغیر ان اسباب کے احمدی طاعون سے محفوظ رہتے یا اگر اس حکم میں استثنائی صورتیں پیدا ہی نہ ہوتیں تو سب لوگ احمدی ہو جاتے اور یہ ایمان ایمان بالغیب نہ ہوتا۔

(۲) دوسری قسم اس تقدیر کی وہ ہے جس میں اسباب موجود بھی نہیں ہوتے اور ساتھ شامل بھی نہیں کئے جاتے۔

یہ تقدیر صرف نبیوںؑ اور مؤمنوں کے سامنے ظاہر ہوتی ہے۔ دوسروں کے سامنے نہیں ہوتی۔ کیونکہ دوسروں کے سامنے اگر یہ تقدیر ظاہر ہو تو وہ ایمان حاصل کرنے کے ثواب سے محروم رہ جائیں۔ لیکن مؤمن جو ایمان بالغیب لا چکتے ہیں ان کو ایمان بالشہادۃ اس تقدیر کے ذریعہ سے دیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ خاص طور پر ایمان میں ترقی کرتے ہیں۔

اس قسم کی تقدیر کی مثال حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں آپ کے کرتہ پر چھینٹے پڑنے کا واقعہ ہے۔ ایک دفعہ آپ نے رؤیا میں دیکھا کہ میں خدا کے سامنے کچھ کاغذات لے کر گیا ہوں اور ان کو خدا کے سامنے پیش کیا ہے۔ خدا نے ان پر دستخط کرتے وقت قلم چھڑکا ہے اور اس کے قطرے میرے کپڑوں پر پڑے ہیں۔ حضرت صاحبؑ کو جب یہ کشف ہؤا۔ اس وقت مولوی عبداللہ صاحب سنوری آپ کے پاؤں دبا رہے تھے۔ دباتے دباتے انہوں نے دیکھا کہ حضرت صاحبؑ کے ٹخنے پر سرخ رنگ کا چھینٹا پڑا ہے۔ جب اس کو ہاتھ لگایا تو وہ گیلا تھا۔ جس سے وہ حیران ہوئے کہ یہ کیا ہے؟ میں نے ان سے سوال کیا تھا کہ کیا آپ کو خیال نہ آیا کہ یہ چھینٹے غیر معمولی نہ تھے بلکہ کسی ظاہری سبب کے باعث تھے۔ انہوں نے کہا مجھے اس وقت خیال آیا تھا اور میں نے ادھر ادھر اور چھت کی طرف دیکھا تھا کہ شاید چھپکلی کی دم کٹ گئی ہو اور اس میں سے خون گرا ہو مگر چھت بالکل صاف تھی۔ اور ایسی کوئی علامت نہ تھی جس سے چھینٹوں کو کسی اور سبب کی طرف منسوب کیا جا سکتا۔ اس لئے جب حضرت صاحبؑ اٹھے تو اس کے متعلق میں نے آپ سے پوچھا۔ آپ نے پہلے تو ٹالنا چاہا۔ لیکن پھر

ساری حقیقت سنائی۔

تو خدا نے اس طرح خاص تقدیر کو بلا کسی سبب کے ظاہر کیا مگر ایک نبی اور اس کے متبع مولوی عبداللہ صاحب کے سامنے۔ کیونکہ وہ ایمان بالغیب لا چکے تھے اور اب ان کو ایمان بالشہادۃ عطا کرنا مدِّ نظر تھا۔

غرض مؤمنوں کے ایمان کو تازہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کبھی کبھی تقدیر بلا اسباب کے بھی ظاہر کرتا ہے تا خدا تعالیٰ کی قدرت کا ثبوت ان کو ملے۔ لیکن کافر کا یہ حق نہیں ہوتا کہ اس کو اس قسم کا مشاہدہ کرایا جائے۔

رسول کریم ﷺ جو سب نبیوں کے سردار تھے اور ہیں، آپؐ کی زندگی میں بھی اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ جب آپ ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے اور کفار مکہ نے آپؐ کا تعاقب کیا اور غار ثور تک پہنچ گئے جہاں آپؐ حضرت ابوبکرؓ سمیت پوشیدہ تھے۔ جو کھوجی کفار کے ساتھ تھا اس نے کہہ دیا کہ یہاں تک آئے ہیں آگے نہیں گئے مگر باوجود اس کے زور دینے کے کسی کو توفیق نہیں ملی کہ گردن جھکا کر دیکھ لے۔ حالانکہ جو لوگ تین میل تک تعاقب کرکے گئے تھے اور تلاش کرتے کرتے پہاڑ پر چڑھ گئے تھے ان کے دل میں طبعاً خیال پیدا ہونا چاہئے تھا کہ اب یہاں تک آئے ہیں تو جھک کر دیکھ لیں کہ شاید اندر بیٹھے ہوں۔ مگر عین موقع پر پہنچ کر بھی کسی نے گردن جھکا کر غار کے اندر نہ دیکھا۔ حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ غار کا منہ اس قدر چوڑا تھا کہ اگر وہ لوگ جھک کر دیکھتے تو ہمیں دیکھ سکتے تھے۔ پس یہ الٰہی تصرف تھا جو ان کے قلوب پر ہؤا اور بظاہر اس کے لئے کوئی سامان موجود نہ تھے۔

یہ تقدیر کی قسم بہت کم ظاہر ہوتی ہے اور اس پر آگاہی صرف مؤمنوں کو دی جاتی ہے تا ان کا ایمان بڑھے۔ غار ثور والے واقعہ میں بھی گو کفار وہاں موجود تھے مگر ان کو یہ نہیں معلوم ہؤا کہ محمد ﷺ وہاں موجود ہیں اور وہ آپؐ کو نہیں دیکھ سکتے۔ اس بات کا علم صرف آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کو تھا۔

رسول کریم ﷺ کا پانی بڑھانا بھی اس قسم کی تقدیر کی ایک مثال ہے۔ آج کل کے لوگ اس نشان کا انکار کردیں تو کردیں لیکن حدیثوں میں اس کثرت سے اس کا ذکر آیا ہے کہ کوئی مسلمان اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ مگر یہ نشان مسلمانوں ہی کے سامنے ہؤا تھا کیونکہ اگر کفار کے سامنے ایسا نشان ظاہر ہوتا تو یا وہ ایمان بالغیب سے محروم رہ جاتے یا ایسے کھلے نشان کو دیکھ

کر بھی ساحر ساحر کہہ کر ایک عاجل عذاب کے مستحق ہو جاتے جو خدا تعالیٰ کی صفت رحیمیت کے منافی تھا۔

## تقدیر کا تعلق اعمال انسانی سے

گو اس وقت تک جو کچھ میں بتا چکا ہوں اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ تقدیر کا وہ مفہوم نہیں ہے کہ جو عوام میں سمجھا جاتا ہے اور جو اسلام کے فلسفیوں نے سمجھا ہے۔ یعنی یہ کہ جو کچھ کرتا ہے بندہ ہی کرتا ہے یا یہ کہ جو کچھ کرتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے بندہ کا اس میں دخل نہیں ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ ایک درمیانی راستہ ہے جو صحیح اور مطابق تعلیم اسلام ہے۔ لیکن اب میں زیادہ تشریح سے اس امر کو بیان کر دیتا ہوں کہ تقدیر کا تعلق اعمال انسانی سے کیا ہے؟

یاد رکھنا چاہئے کہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں تقدیر کئی قسم کی ہے۔ تقدیر عام طبعی اور تقدیر عام شرعی۔ تقدیر خاص طبعی اور تقدیر خاص شرعی۔ ان میں سے اول الذکر تقدیر ہی ہے جو سب انسانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے ماتحت سب کارخانہ عالم چل رہا ہے۔ یعنی ہر ایک چیز میں کچھ خاصیتیں پیدا کر دی ہیں وہ اپنی مفوضہ خدمت کو اپنے دائرہ میں ادا کر رہی ہیں۔ مثلاً آگ میں جلانے کی خاصیت رکھی ہے۔ جب آگ کسی ایسی چیز کو لگائی جائے گی جس میں جلنے کی طاقت رکھی ہوئی ہے تو وہ اسے جلا دے گی اور اس چیز کا جلنا تقدیر کے ماتحت ہو گا۔ لیکن خدا تعالیٰ نے یہ مقرر نہیں فرمایا کہ فلاں شخص فلاں شخص کے گھر کو آگ لگا دے۔ چیزوں کی خاصیت خدا نے پیدا کی ہے مگر ان کے استعمال کے متعلق اللہ تعالیٰ کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ چور جب چوری کرتا ہے تو یہ بات بے شک تقدیر ہے کہ جب وہ غیر کے مال کو اٹھاتا ہے تو وہ مال اٹھ جاتا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ نے یہ بات مقرر نہیں کی کہ زید بکر کا مال اٹھا لے۔ زید کو طاقت حاصل تھی کہ خواہ اس کا مال اٹھاتا خواہ نہ اٹھاتا۔ یا مثلاً بارش آتی ہے تو وہ ایک عام قاعدہ کے ماتحت آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس کے متعلق کوئی خاص حکم نہیں ہوتا کہ فلاں جگہ اور فلاں وقت بارش ہو۔ پس بارش کا آنا ایک تقدیر ہے مگر تقدیر خاص نہیں۔ ایک عام قاعدہ اللہ تعالیٰ نے بنا دیا ہے۔ اس قاعدہ کے ماتحت بارش آجاتی ہے اور جیسے حالات ہوتے ہیں ان کے ماتحت برس جاتی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے اس تقدیر عام کے علاوہ اور تقدیریں بھی ہیں۔ اور ان میں اللہ تعالیٰ کے خاص احکام نازل ہوتے ہیں۔ اور اس وقت جب وہ تقدیریں نازل ہوتی ہیں تو تقدیر عام کو پھیر کر ان تقدیروں کے

مطابق کر دیا جاتا ہے یا تقدیر عام کے قواعد کو توڑ دیا جاتا ہے۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کے وقت۔ مگر یہ تقدیر ہر ایک کے لئے اور ہر روز نازل نہیں کی جاتی بلکہ یہ تقدیریں خاص بندوں کے لئے نازل ہوتی ہیں یا ان کی مدد کے لئے یا ان کے دشمنوں کی ہلاکت کے لئے۔ کیونکہ خاص سلوک خاص ہی لوگوں سے کیا جاتا ہے۔ یا ان تقدیروں کے نزول کا محرک کسی شخص کی قابل رحم حالت ہوتی ہے جو خواہ خاص طور پر نیک نہ ہو مگر اس کی حالت خاص طور پر قابل رحم ہو جائے۔ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کی رحمانیت جوش میں آکر اس کی صفت قادریت کو جوش میں لاتی ہے۔ جو اس مسکین کی مصیبت کو دور کرتی یا اس پر ظلم کرنے والے کو سزا دیتی ہے۔ یہ تقدیر خاص جو نازل ہوتی ہے کبھی انسانی اعضاء پر بھی نازل ہوتی ہے یعنی انسان کو مجبور کرکے اس سے ایک کام کروایا جاتا ہے۔ مثلاً زبان کو حکم ہوجاتا ہے کہ وہ ایک خاص فقرہ بولے اور خواہ بولنے والے کا دل چاہے نہ چاہے اسے وہ فقرہ بولنا پڑتا ہے اور اس کی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اس کو روک سکے۔ یا کبھی ہاتھ کو کوئی حکم ہو جاتا ہے اور کبھی سارے جسم کو کوئی حکم ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت انسان کا تصرف اپنے ہاتھ یا جسم پر نہیں رہتا بلکہ خدا تعالیٰ کا تصرف ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ان کی خلافت کے ایام میں وہ منبر پر چڑھ کر خطبہ پڑھ رہے تھے کہ بے اختیار ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے۔ یَا سَارِیَۃُ اَلْجَبَلَ، یَا سَارِیَۃُ اَلْجَبَلَ یعنی اے ساریہ پہاڑ پر چڑھ جا۔ اے ساریہ پہاڑ پر چڑھ جا۔ چونکہ یہ فقرات بے تعلق تھے لوگوں نے ان سے سوال کیا کہ آپ نے یہ کیا کہا؟ تو آپ نے فرمایا کہ مجھے دکھایا گیا کہ ایک جگہ ساریہ جو اسلامی لشکر کے ایک جرنیل تھے کھڑے ہیں اور دشمن ان کے عقب سے اس طرح حملہ آور ہے کہ قریب ہے کہ اسلامی لشکر تباہ ہو جائے۔ اس وقت میں نے دیکھا تو پاس ایک پہاڑ تھا کہ جس پر چڑھ کر وہ دشمن کے حملہ سے بچ سکتے تھے۔ اس لئے میں نے ان کو آواز دی کہ وہ اس پہاڑ پر چڑھ جاویں۔ ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ساریہ کی طرف سے بعینہٖ اسی مضمون کی اطلاع آئی اور انہوں نے یہ بھی لکھا کہ اس وقت ایک آواز آئی جو حضرت عمرؓ کی آواز سے مشابہ تھی جس نے ہمیں خطرہ سے آگاہ کیا اور ہم پہاڑ پر چڑھ کر دشمن کے حملہ سے بچ گئے۔ (تاریخ ابن کثیر اردو جلد ۷ صفحہ ۲۶۵-۲۶۶) اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی زبان اس وقت ان کے اپنے قابو سے نکل گئی تھی اور اس قادر مطلق ہستی کے قبضہ میں تھی جس کے لئے فاصلہ اور دوری کوئی شے ہے ہی نہیں۔

پس تقدیر کبھی اعضاء پر جاری کی جاتی ہے اور جس طرح بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جبر سے کام کراتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ جبر سے انسان سے کام لیتا ہے۔ جس میں انسان کا کچھ دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ محض ایک ہتھیار کی طرح ہوتا ہے یا مردہ کی طرح ہوتا ہے جس میں خود ہلنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ وہ زندہ کے اختیار میں ہوتا ہے وہ جس طرح چاہے اس سے کرے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ ایسی ہی تقدیر کے ماتحت تھا اور ان کا کچھ دخل نہ تھا ورنہ ان کی کیا طاقت تھی کہ اس قدر دور اپنی آواز پہنچا سکتے۔

رسول کریم ﷺ کی ذات تو تمام قسم کے معجزات کی جامع ہے۔ آپؐ کی زندگی میں بھی اس قسم کی تقدیر کی بہترین مثالیں پائی جاتی ہیں۔ آپؐ ایک دفعہ ایک جنگ سے واپس آرہے تھے۔ راستہ میں ایک جنگل میں دوپہر کے وقت آرام کرنے کے لئے ٹھہر گئے۔ تمام صحابہؓ ادھر ادھر بکھر کر سو گئے۔ کیونکہ کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ آپؐ بھی اکیلے ایک جگہ لیٹ گئے کہ یکدم آپؐ کی آنکھ کھلی اور آپؐ نے دیکھا کہ ایک اعرابی کے ہاتھ میں آپؐ کی تلوار ہے اور وہ آپؐ کے سامنے تلوار کھینچے کھڑا ہے۔ جب آپؐ کی آنکھ کھلی تو اس نے دریافت کیا کہ بتا اب تجھے کون بچا سکتا ہے؟ آپؐ نے کہا خدا۔ آپؐ کا یہ کہنا تھا کہ اعرابی کے ہاتھ سے تلوار گر گئی۔ (مسلم کتاب الفضائل باب توکلہ علی اللّٰہ تعالٰی و عصمۃ اللّٰہ تعالٰی من الناس) اس وقت اگر ساری دنیا بھی کوشش کرتی کہ اس کے ہاتھ سے تلوار نہ گرے تو کچھ نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ انسان کو وہاں تک پہنچنے میں دیر لگتی سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ایسے خاص اوقات میں اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کے لئے خاص تقدیر جاری ہوتی ہے۔ اس اعرابی کے لئے جس کا دماغ صحیح تھا اور جو ارادہ رکھتا تھا کہ رسول کریم ﷺ کو مارے خدا تعالیٰ کی یہ تقدیر نازل ہوئی کہ اس کا ہاتھ نہ ہلے اور وہ نہ ہلا۔ یہ ایک تقدیر تھی جو ایک خاص وقت ایک خاص شخص کے ایک عضو پر جاری ہوئی۔ لیکن کیا ایسی تقدیروں کے ہوتے ہوئے کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ انسان مجبور ہے؟ یہ تقدیریں ہیں۔ لیکن باوجود ان کے انسان مجبور نہیں ہے بلکہ قابل مؤاخذہ ہے۔ کیونکہ یہ تقدیریں ہمیشہ جاری نہیں ہوتیں بلکہ خاص حالتوں میں جاری ہوتی ہیں۔ اور ایسی کوئی تقدیر جاری نہیں کی جاتی جس کے سبب سے انسان مجبور قرار پاسکے۔ اور عقاب و ثواب کے دائرہ سے نکل جاوے۔

ایک دوسری مثال اس قسم کی تقدیر کی آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ہمیں اور بھی ملتی

ہے۔ رسول کریم ﷺ پر جب عرب کے لوگوں نے اجتماع کر کے وہ حملہ کیا جو غزوہ احزاب کہلاتا ہے تو اس سے پہلے یہود سے آپؐ کا معاہدہ ہو چکا تھا کہ اگر کوئی دشمن مدینہ پر حملہ کرے گا تو یہود اور مسلمان مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔ اس موقع پر ان کا فرض تھا کہ مدد کرتے لیکن انہوں نے اس کے برخلاف آپ کے دشمنوں سے یہ منصوبہ گانٹھا کہ باہر مردوں پر تم حملہ کرو اور شہر میں ہم ان کی عورتوں اور بچوں کو مار ڈالیں گے۔ جب رسول کریم ﷺ لڑنے کے لئے گئے تو کفار نہ لڑے۔ واپس آکر آپؐ نے یہود سے پوچھا کہ بتاؤ اب تمہاری کیا سزا ہونی چاہئے۔ ان کو محمد ﷺ جیسا رحیم کریم انسان سزا دیتا تو وہی دیتا جو لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ [a] کے ذریعہ اس نے مکہ والوں کو دی تھی۔ یعنی معاف کر دیتا۔ مگر انہوں نے کہا ہم تیری بات نہیں مانیں گے۔ یہ بات معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہی ان کے مونہہ سے جاری کرائی کیونکہ ان کو سالہاسال کا تجربہ تھا کہ آنحضرت ﷺ اپنے دشمنوں سے نہایت نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ جب ان لوگوں سے دریافت کیا گیا کہ تم کس کی بات مانو گے تو انہوں نے حضرت سعدؓ کا نام لیا۔ جب سعدؓ سے دریافت کیا گیا کہ ان کو کیا سزا دی جاوے تو انہوں نے کہا کہ ان کے جتنے تلوار اٹھانے والے جوان ہیں سب قتل کئے جاویں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ (بخاری کتاب المغازی باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب الخ) یہود کی زبان پر کیوں یہ تقدیر جاری کی گئی؟ اس لئے کہ محمد ﷺ کی زبان پر ان کے رحم اور ان کے مقام کی وجہ سے یہ تقدیر جاری نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس کے جاری ہونے کا یہ مطلب ہوتا کہ آپ کا دل سخت ہو جاتا۔ مگر کافروں کی زبان پر جاری ہو سکتی تھی کیونکہ ان کے دل پہلے ہی سخت تھے۔ پس یہ تقدیر انہی کے منہ سے اس طرح جاری کرائی کہ ہم تیری بات نہیں مانتے بلکہ فلاں کی بات مانتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یہ دونوں تقدیریں جو اعمال پر یا زبان پر جاری ہوتی ہیں یہ شرعی اعمال میں نہیں ہوتیں۔ کیونکہ قیامت کے دن شرعی اعمال کی پُرسش ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جبراً حضرت عمرؓ سے نمازیں نہیں پڑھوائیں۔ اگر جبراً کیا تو یہ کیا کہ زبان پر جاری کرا دیا کہ ساریہ پہاڑ پر چڑھ جاؤ۔ اسی طرح خدا نے یہود کے متعلق یہ نہیں کیا کہ جبراً ان کو نماز سے روک دیتا یا محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لانے دیتا۔ بلکہ صرف ایک سیاسی معاملہ میں جزائے عمل کے متعلق تقدیر نازل کی۔ تو یہ تقدیر شرعی اعمال پر جاری نہیں ہوتی بلکہ ان اعمال میں ہوتی ہے جن میں کوئی بھی عمل ہو اس سے انسان شرعی سزا کا مستحق نہیں ہوتا کیونکہ اگر شرعی اعمال پر تقدیر جاری

[a] زاد المعاد لابن قیم جلد ۱ صفحہ ۴۲۴

ہو۔ جبراً چوری کروائی جاوے یا نماز پڑھوائی جاوے تو پھر سزا یا انعام کی وجہ نہیں رہتی بلکہ سزا کا دینا ایسے حالات میں ظلم ہو جاتا ہے جس سے خدا تعالیٰ پاک ہے۔

## تقدیر کے نزول کے وقت استعمال اسباب جائز ہے یا نہیں؟

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ جب تقدیر جاری ہوتی ہے تو بندہ کو اسباب کے استعمال کی طاقت ہوتی ہے یا نہیں۔ اور اگر طاقت ہوتی ہے تو پھر اسباب کے استعمال کی اجازت ہوتی ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ جو تقدیر جوارح پر جاری ہوتی ہے اس کے مقابلہ میں انسان کو استعمال اسباب کی طاقت نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کی زبان کو جب خاص الفاظ استعمال کرنے کا حکم ہؤا تھا ان کی طاقت نہ تھی کہ دنیا کے کسی سامان کو بھی استعمال کر کے وہ اپنی زبان کو اس فقرہ کے بولنے سے روک سکتے۔ یا اس کافر کے ہاتھ پر جب تقدیر جاری ہوئی کہ شل ہو کر تلوار اس سے گر جاوے اور محمد رسول اللہ ﷺ پر حملہ نہ کر سکے اس کی طاقت نہ تھی کہ اس کے خلاف کچھ کر سکے۔ اسی طرح جب دل پر تقدیر جاری ہوتی ہے تو اس تقدیر کے خلاف انسان کا میلان ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن جو تقدیریں کہ خود انسان کے قلب اور جوارح پر جاری نہیں ہوتیں بلکہ دوسروں پر جاری ہوتی ہیں یا اس کے جسم کے ایسے حصوں پر جاری ہوتی ہیں جن کا کام طبعی ہے اس کے ارادہ کے ماتحت نہیں ہے اس وقت ایسے اسباب کے استعمال کی طاقت ہوتی ہے۔

ایسی حالت میں پھر دو صورتیں ہوتی ہیں اول یہ کہ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے تقدیر نازل ہوئی ہے۔ دوم وہ حالت کہ اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی تقدیر نازل ہوئی ہے۔ جب اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ تقدیر نازل ہوئی ہے اس وقت اگر یہ اسباب استعمال کرتا ہے تو اسے کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ تقدیر نازل کی ہے تو اس وقت اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ یا تو اس کو خود اللہ تعالیٰ کی ہی طرف سے بعض اسباب یا کُل اسباب کے استعمال کرنے کا حکم ہوتا ہے۔ یعنی تقدیر تو ہوتی ہے مگر ان اسباب سے معلق ہوتی ہے۔ مثلاً رسول کریم ﷺ کے لئے فتح پانا مقدر ہو چکا تھا مگر وہ تقدیر معلق تھی جنگ کے ساتھ۔ پس ایسے وقت میں بندہ کے لئے فرض ہوتا ہے کہ بعض یا کُل اسباب کو استعمال نہ کرے۔ اگر کرے گا تو اس کو نقصان پہنچے گا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہوگی۔ اور اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ بندہ کو بتایا جائے کہ خدا تعالیٰ بغیر

اسباب کے بھی کام کر سکتا ہے۔ اس کی مثال میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ ایک دفعہ آپ کو کھانسی کی شکایت تھی۔ مبارک احمد کے علاج میں آپ ساری ساری رات جاگتے تھے۔ میں ان دنوں بارہ بجے کے قریب سوتا تھا اور جلدی ہی اٹھ بیٹھتا تھا۔ لیکن جب میں سوتا اس وقت حضرت صاحبؑ کو جاگتے دیکھتا اور جب اٹھتا تو بھی جاگتے دیکھتا اس محنت کی وجہ سے آپ کو کھانسی ہو گئی۔ ان دنوں میں ہی آپ کو دوائی وغیرہ پلایا کرتا تھا اور چونکہ دوائی کا پلانا میرے سپرد تھا اس لئے ڈاکٹروں کے مشورہ کے مطابق ایسی باتوں پر جو کھانسی کے لئے مضر ہوں ٹوک بھی دیا کرتا۔ ایک دن ایک شخص آپ کے لئے تحفہ کے طور پر کیلے لایا۔ حضرت صاحبؑ نے کیلا کھانا چاہا مگر میرے منع کرنے پر کہ آپ کو کھانسی ہے آپ کیوں کیلا کھاتے ہیں آپ نے کیلا مسکرا کر رکھ دیا۔ غرض چونکہ میں ڈاکٹروں کی ہدایات پر عمل کراتا تھا اور تیماردار تھا آپ میری بات بھی مان لیتے تھے۔ انہی دنوں ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین صاحب حضرت صاحبؑ کے لئے فرانسیسی سیب لائے جو اتنے کھٹے تھے کہ کھانسی نہ بھی ہو تو ان کے کھانے سے ہو جائے۔ لیکن حضرت صاحبؑ نے تراش کر ایک سیب کھانا شروع کر دیا۔ میں نے منع کیا لیکن آپ نے نہ مانا اور کھاتے چلے گئے۔ میں بہت کڑھتا رہا کہ اس قدر کھانسی کی آپ کو تکلیف ہے مگر پھر بھی آپ ایسا ترش میوہ کھا رہے ہیں۔ لیکن آپ نے پرواہ نہ کی اور سیب کی پھانکیں کر کے کھاتے گئے اور ساتھ ساتھ مسکراتے بھی گئے۔ جب سیب کھا چکے تو فرمایا۔ تمہیں نہیں معلوم مجھے الہام ہؤا ہے کہ کھانسی دور ہو گئی ہے اور اب کسی احتیاط کی ضرورت نہیں۔ اس لئے میں نے اللہ تعالیٰ کے کلام کے ادب کے طور پر یہ سیب باوجود ترش ہونے کے کھا لیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد آپ کی کھانسی اچھی ہو گئی اور کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی۔

## بعض حالات میں کیوں اسباب استعمال کرائے جاتے ہیں؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض حالات میں بندہ سے کیوں اسباب استعمال کرائے جاتے ہیں؟ بلا اسباب کیوں کام نہیں ہو جاتے؟ اس کے لئے یاد رکھنا چاہئے کہ اول اگر ہمیشہ بلا اسباب کام لیا جاوے تو ایمان بالغیب جو حصول انعام اور ثواب کیلئے ضروری ہے باطل ہو جائے۔ علاوہ ازیں چونکہ بندہ کا عمل بھی خدا کے رحم کو جذب کرتا ہے اس لئے تقدیر بھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ رحمت کے

جذب کرنے کے لئے خدا تعالیٰ اسباب بھی استعمال کراتا ہے۔ اسباب تقدیر کے راستہ میں نہ روک ہو سکتے ہیں اور نہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی کمزوری اور بے بسی جاذب رحمت ہو جاتی ہے۔

دوم۔ اسباب سے کام لینے کا اس لئے بھی حکم ہے کہ بندہ پر اس کی سعی کی کمزوری ظاہر ہو۔ اگر بلا اسباب کام ہو جائے تو بہت دفعہ انسان یہ خیال کرلے کہ اگر میں اس کام کو کرتا تو نہ معلوم کس طرح کرتا جب وہ ساتھ ساتھ سعی کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا جاتا ہے کہ اس کی سعی کمزور ہے اور اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کا فضل کیا کام کر رہا ہے۔ پس سعی انسان کے ایمان کو مضبوط کرتی ہے۔ اور انسان ساتھ کے ساتھ دیکھتا جاتا ہے کہ اگر میرے ذمہ ہی یہ کام ہوتا تو میری کوشش اور سعی بس اس حد تک ہی پہنچ سکتی تھی اور آخر مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ بصورت دیگر اسے تقدیر ایک اتفاق نظر آتی اور سستی مزید برآں پیدا ہوتی۔

اس استعمال سامان کے متعلق میں ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ رسول کریم ﷺ کے متعلق یہ تقدیر نازل ہو چکی تھی کہ آپؐ کامیاب ہوں گے اور آپؐ کے دشمن ناکام۔ اگر بلا کسی باعث کے اپنے اپنے گھروں میں لوگ بیمار پڑکر مرجاتے تو سب لوگ کہتے کہ یہ اتفاق تھا لوگ مرا ہی کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس تقدیر کو اسباب کے ذریعہ ظاہر کرکے اپنی قدرت کا خاص ثبوت دیا۔

جنگ بدر کا ایک واقعہ اس امر کو خوب روشن کر دیتا ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کہتے ہیں کہ اس دن میرا دل چاہتا تھا کہ آج دشمنوں کے مقابلہ میں خوب دادِ مردانگی دوں۔ (کیونکہ یہ پہلی جنگ تھی جس میں کفار اور مسلمانوں کا جم کر مقابلہ ہونے والا تھا۔ اور جس میں ایک طرف مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل اور دوسری طرف خدا اور رسولؐ موجود تھے اور مسلمانوں کو کفار کے مظالم ایک ایک کرکے یاد آرہے تھے) اور چونکہ لڑائی میں جس سپاہی کے دائیں بائیں بھی طاقتور آدمی ہوں وہی خوب لڑ سکتا ہے۔ میں نے بھی اپنے دائیں بائیں دیکھا لیکن میرے افسوس کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ میری دونوں جانب چودہ چودہ سال کے دو انصار لڑکے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ آج میں نے کیا لڑنا ہے۔ یہ وسوسہ ابھی میرے دل میں پیدا ہی ہؤا تھا کہ ان میں سے ایک نے مجھے کہنی ماری اور میرے کان میں آہستہ سے کہا تاکہ دوسرا نہ سن لے کہ چچا! ابوجہل کون سا ہے؟ دل چاہتا ہے کہ اس کو قتل کر دوں

کیونکہ سنا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو سخت دکھ دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں اس کی یہ بات سن کر میں تو حیران رہ گیا کیونکہ یہ خیال میرے دل میں بھی نہ آیا تھا۔ لیکن ابھی میں نے اس کی پوری بات نہ سنی تھی کہ دوسرے نے میرے دوسرے پہلو میں کہنی ماری اور آہستہ سے تاکہ دوسرا نہ سن لے اس نے بھی یہی دریافت کیا کہ چچا! ابو جہل کون سا ہے؟ جس نے سنا ہے رسول کریم ﷺ پر بڑے بڑے ظلم کئے ہوئے ہیں۔ اس پر میری حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ لیکن میری حیرت کی اس وقت کوئی حد نہ رہی جب میرے ابو جہل کی طرح اشارہ کرتے ہی باوجود اس کے کہ اس کے ارد گرد بڑے بڑے بہادر سپاہی کھڑے تھے وہ دونوں لڑکے شکروں کی طرح جھپٹ کر اس پر حملہ آور ہوئے (بخاری کتاب العفازی باب فضل من شهد بدرًا) اور چاروں طرف کی تلوار کے وار بچاتے ہوئے اس تک پہنچ ہی گئے اور اس کو زخمی کرکے گرا دیا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی ہلاکت کے لئے جنگ کرانا اور مسلمانوں کا ان کے مقابلہ پر جانا ایک سبب تھا۔ مگر خود اس تدبیر کی کمزوری ہی اس تقدیر کی عظمت پر دلالت تھی جو خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے جاری کی تھی۔ مگر یہ تدبیر نہ ہوتی تو اس تقدیر کی شان بھی اس طرح ظاہر نہ ہوتی اور صحابہؓ کو اپنی کمزوری اور اللہ تعالیٰ کے جلال کا ایسا پتہ نہ لگتا جو اَب لگا۔ درحقیقت اپنی تلواروں میں ہی انہوں نے خدا تعالیٰ کی چمکتی ہوئی تلوار کو دیکھا اور ان اسباب میں ہی اپنی بے اسبابی کا علم حاصل کیا۔ تیرہ۱۳ چودہ۱۴ سال کے لڑکے کس طرح ابو جہل کو مار سکتے تھے مگر انہوں نے مارا۔ یہی حال ان دوسرے لوگوں کا تھا جو اس جنگ میں قتل کئے گئے۔ یہی وجہ تھی کہ خدا تعالیٰ اس جنگ کے متعلق فرماتا ہے۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (الانفال: ۱۸) کہ تم نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ ہم نے کیا ہے۔ پھر رسول کریم ﷺ کو فرمایا ہے۔ وَمَارَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال: ۱۸) جب تُو نے ان کفار پر پتھر پھینکے تھے۔ یہ پھینکنا تیری طرف سے نہ تھا بلکہ ہماری طرف سے تھا۔ بے شک کنکر تو رسول اللہ ﷺ نے پھینکے تھے مگر چونکہ آندھی خدا کی طرف سے چلائی گئی تھی اور اسی نے دشمن کو جنگ کے ناقابل کر دیا تھا اس لئے خدا تعالیٰ ہی کی طرف اس فعل کو منسوب کیا گیا۔ پس تقدیر کے ظہور میں بعض اوقات بے اسبابی کے اظہار کے لئے اسباب رکھے جاتے ہیں۔

سوئم انسان کو محنت اور کوشش کا پھل دینے کے لئے تقدیر کے ساتھ اسباب کے استعمال کا

بھی حکم دیا جاتا ہے۔ مثلاً صحابہ کرامؓ کو جنگوں کا ثواب ملا اگر یونہی فتح ہو جاتی تو کہاں ملتا۔ وہ تقدیر محتاج نہ تھی صحابہؓ کی تلوار کی مگر صحابہؓ محتاج تھے تقدیر کے ساتھ عمل کرنے کے تاکہ ثواب سے محروم نہ رہ جائیں۔ یہ تین موٹی موٹی وجوہ ہیں تقدیر کے ساتھ اسباب کے استعمال کرنے کی۔

اب سوال ہو سکتا ہے کہ پھر بعض اوقات تقدیر میں اسباب سے منع کیوں کیا جاتا ہے؟

اس کے لئے یاد رکھنا چاہئے کہ کبھی خدا تعالیٰ مؤمن کو بغیر اسباب کے تقدیر کا اظہار کر کے اپنا جلال دکھانا چاہتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ اس کی قدرت کے مقابلہ میں سب اسباب ہیچ ہیں اور خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

## کیا تقدیر ٹل سکتی ہے؟

اب میں اس سوال کا جواب دیتا ہوں کہ کیا تقدیر ٹل سکتی ہے؟ اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ ہاں ٹل سکتی ہے۔ تقدیر کے معنی فیصلے کے ہیں اور جو فیصلہ دے سکتا ہے وہ اسے بدل بھی سکتا ہے۔ اور فیصلہ کر کے اس کو بدل نہ سکنا کمزوری کی علامت ہے جو خدا تعالیٰ میں نہیں پائی جا سکتی۔

## تقدیر کس طرح ٹل سکتی ہے؟

اب میں بتاتا ہوں کہ تقدیر کس طرح ٹل سکتی ہے۔ اول تقدیر عام طبعی ٹل سکتی ہے تقدیر عام طبعی سے۔ مثلاً تقدیر عام طبعی یہ ہے کہ آگ لگے تو کپڑا جل جائے۔ اب اگر کسی کپڑے کو آگ لگائی جائے اور وہ جلنے لگے تو کہا جاوے گا کہ اس پر تقدیر عام طبعی جاری ہو گئی ہے مگر اس وقت کے متعلق ایک اور تقدیر بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر آگ پر پانی ڈال دیا جائے تو وہ اسے بجھا دیتا ہے۔ پس جب پانی آگ پر ڈالا جائے گا تو وہ بجھ جائے گی اور اس طرح ایک تقدیر عام طبعی دوسری تقدیر عام طبعی کو ٹلا دے گی۔ پس تقدیر عام ٹل سکتی ہے اور وہ اس طرح کہ اس کے مقابل میں ایک دوسری تقدیر کو جاری کر دیا جائے اور اس طرح اسے مٹا دیا جائے۔ اگر کوئی کہے کہ جو مثال دی گئی ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تدبیر نے تقدیر کو ٹلا دیا نہ کہ تقدیر نے تقدیر کو۔ کیونکہ پانی کو انسان ڈالتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر پانی انسان نے ڈالا ہے تو آگ بھی تو بسا اوقات انسان خود ہی دانستہ یا نادانستہ لگاتا ہے۔ پس جس طرح پہلے فعل کو تقدیر کہا جاتا ہے دوسرے فعل کو بھی تقدیر کہا جاوے گا۔ دوسرے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے انسان کا فعل تو تقدیر ہوتا ہی نہیں (سوائے ان صورتوں کے جو بیان ہوئیں) ہماری مراد آگ لگنے سے بھی اور اس

کے بجھنے سے بھی انسانی فعل کی طرف اشارہ کرنا نہیں بلکہ جلنے اور بجھنے کی قابلیت سے ہے۔ پس صحیح یہی ہے کہ ایک تقدیر نے دوسری تقدیر کو بدل دیا۔ ورنہ خدا تعالیٰ اگر آگ میں جلانے کی خاصیت نہ رکھتا تو کون کسی چیز کو جلا سکتا اور اگر وہ پانی میں بجھانے کا مادہ نہ رکھتا تو کون اس کے ذریعہ سے آگ کو بجھا سکتا۔

اسی طرح مثلاً اگر ایک شخص زیادہ مرچیں کھالیتا ہے جو اس کی انتڑیوں کو چیرتی جاتی ہیں اور ان میں خراش پیدا کر دیتی ہیں تو وہ کہتا ہے یہ تقدیر ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ ایک تقدیر سے کام لیتا ہے یعنی گھی یا کوئی اور چکنائی یا لعاب اسپغول کھالیتا ہے جس سے خراش دور ہو جاتی ہے اور یہ پہلی تقدیر کو مٹا دیتی ہے۔

اس سے بڑی مثال حضرت عمرؓ کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے۔ اس وقت اسلامی لشکر میں طاعون پڑی اور ابو عبیدہؓ بن الجراح جو لشکر کے سردار تھے ان کا خیال تھا کہ وبائیں تقدیر الٰہی کے طور پر آتی ہیں۔ پس وہ پرہیز وغیرہ کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ جب اس لشکر کی طرف گئے اور مہاجرین و انصار کے مشورہ سے واپس لوٹنے کی تجویز کی تو اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا۔ اَفِرَارًا مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ۔ یعنی اے عمر! کیا آپ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگ کر جاتے ہیں؟ آپؓ نے فرمایا۔ نَعَمْ نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ اِلٰى قَدَرِ اللّٰهِ۔ (بخاری کتاب الطب باب ما یذکر فی الطاعون) یعنی ہم اللہ تعالیٰ کی قدر سے بھاگ کر اسی کی قدر کی طرف جاتے ہیں۔ اور یہ بات وہی تھی جو مسلمانوں کو ایک مسنون دعا میں سکھائی گئی ہے۔ اور جس کے متعلق ہر ایک مسلمان سے امید کی جاتی ہے کہ وہ اسے سونے سے قبل دعا کے طور پر پڑھا کرے اور اس کے بعد کوئی کلام نہ کیا کرے۔ اس دعا میں آتا ہے۔

لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجٰى مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ ۔ (بخاری کتاب الدعوات باب اذا بات طاھرًا)

یعنی اے خدا! تیرے غضب سے بچنے کی اور اس سے پناہ پانے کی سوائے تیری درگاہ کے اور کوئی جگہ نہیں۔

ایک تقدیر کے مقابلہ میں دوسری تقدیر کے استعمال کرنے کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی کا ایک ہاتھ خالی ہو اور دوسرے میں روٹی ہو۔ کوئی شخص خالی ہاتھ کو چھوڑ کر دوسرے کی طرف جائے اور کوئی اسے کہے کہ کیا تم اس ہاتھ سے بھاگتے ہو؟ وہ یہی جواب دے گا کہ میں اس سے نہیں بھاگتا بلکہ اس کے دوسرے ہاتھ کی طرف متوجہ ہؤا ہوں۔

(۲) جس طرح تقدیر عام طبعی کو تقدیر عام طبعی سے ٹلایا جاتا ہے۔ اسی طرح اسے تقدیر خاص طبعی سے بھی ٹلایا جا سکتا ہے۔ اگر کسی شخص کے خلاف دنیاوی اسباب جمع ہو رہے ہوں اور وہ ان کا مقابلہ نہ کر سکتا ہو تو وہ خدا تعالیٰ کے فضل کا جاذب ہو کر اس کی خاص تقدیر کے ذریعہ سے اس کو ٹلا سکتا ہے۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ ہے۔ تقدیر عام یہ ہے کہ آگ جلائے مگر حضرت ابراہیمؑ کے لئے خاص تقدیر جاری ہوئی کہ آگ ان کو نہ جلا سکے۔ اور وہ آگ کے ضرر سے محفوظ رہے۔ اسی طرح تقدیر عام یہ ہے کہ انسان قتل ہونے کی قابلیت رکھتا ہے لیکن رسول کریم ﷺ کی نسبت اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ (المائدۃ: ۶۸) اور اب آپ کو دنیا قتل نہیں کر سکتی تھی کیونکہ تقدیر عام کو تقدیر خاص نے بدل دیا۔ اسی طرح حضرت مسیح موعودؑ کے ساتھ بھی ہؤا۔

(۳) جس طرح تقدیر عام طبعی، تقدیر عام طبعی اور تقدیر خاص طبعی سے ٹل جاتی ہے۔ اسی طرح تقدیر خاص، تقدیر خاص سے ٹل جاتی ہے۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ کبھی ایک شخص کے لئے اس کے بعض حالات کے مطابق ایک خاص حکم دیا جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے اندر تبدیلی کر لیتا ہے تو پھر اس حکم کو بھی بدل دیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اللہ تعالیٰ کے دین کے راستہ میں خاص طور پر روک بن جاتا ہے اور لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ اسے موت دی جائے لیکن بسا اوقات وہ شخص اس حکم کے اجراء سے پہلے تائب ہو جاتا ہے یا کسی قدر اصلاح کر لیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی پہلے حکم کی منسوخی کا حکم مل جاتا ہے۔

خاص تقدیر کے خاص تقدیر سے بدلنے کی مثال آتھم کا واقعہ ہے۔ اس نے اپنی کتب میں اور زبانی طور پر رسول کریم ﷺ کی ہتک کرنی چاہی اور آپؐ کو (نعوذ باللہ من ذالک) دجّال کہا اور پھر اس پر ضد کی اور اصرار کیا اور آپؐ کے نائب اور اللہ تعالیٰ کے مأمور مسیح موعودؑ سے مباحثہ کیا اس پر خدا تعالیٰ کی تقدیر جاری ہوئی کہ اگر وہ حق کی طرف رجوع نہیں کرے گا تو پندرہ ماہ کے اندر ہاویہ میں گرایا جائے گا۔ یہ خاص تقدیر تھی لیکن جب وہ ڈر گیا اور اس نے علی الاعلان کہا کہ میں محمد (ﷺ) کی نسبت یہ الفاظ استعمال نہیں کرتا اور بدزبانی چھوڑ کر خاموشی اختیار کر لی تو یہ تقدیر ٹلا دی گئی۔ اگر کوئی تلوار لے کر کسی پر حملہ کرے اور کہے کہ چونکہ تم مجھ سے لڑتے ہو۔ اس لئے میں بھی تمہارے قتل کے لئے کھڑا ہوں اور اب میں تم کو

قتل کر دوں گا۔ اس پر حملہ آور اپنی تلوار نیچی کر لے تو یہی اس کا لڑائی سے رجوع سمجھا جائے گا۔ اور یہ ضروری نہیں ہو گا کہ وہ بغل گیر بھی ہو جائے۔ ہمارے مخالفین کہتے ہیں کہ آتھم کے متعلق رجوع الی الحق کی شرط تھی جس کا یہ مطلب ہے کہ وہ اسلام لائے۔ ہم کہتے ہیں کہ رجوع الی الحق کے اندر تو رسول کریم ﷺ کا مقام بھی آجاتا ہے اس کے معنی یہی نہیں ہیں کہ انسان گمراہی سے حق کی طرف آئے بلکہ حق کی طرف بار بار توجہ کرنا بھی رجوع الی الحق کہلاتا ہے تو کیا پھر اس رجوع الی الحق کے یہ معنی کئے جاویں گے کہ آتھم نبیوں کے مقام کو پہنچ جائے تب اسے معاف کیا جائے گا۔ دراصل رجوع الی الحق کے کئی درجے ہیں۔ مسلمان ہونا، حضرت مسیح موعودؑ کو مان لینا، شہداء میں داخل ہونا، صدیق بننا، مگر یہ بھی رجوع الی الحق ہے جو رسول کریم ﷺ کو گالیاں دیتا ہو اس کا رک جانا۔ اور یہ رجوع الی الحق آتھم نے کیا اور اس کا فائدہ اٹھایا۔ اس کے متعلق جو خاص تقدیر جاری ہوئی تھی اسے دوسری تقدیر خاص نے ٹلا دیا اور خدا تعالیٰ کی صفت رحم نے اپنا غلبہ ثابت کر دیا۔

## تقدیر کے ٹلنے کا پیشگوئیوں سے تعلق

چونکہ پیشگوئیوں سے نبوت کی صداقت کا بہت بڑا تعلق ہوتا ہے اور ان کے ٹلنے سے دشمنانِ انبیاء کو شور کا موقع ملتا ہے اور پیشگوئیاں مسئلہ تقدیر کی ہی ایک شاخ ہیں اس لئے میں بتاتا ہوں کہ تقدیر اور پیشگوئیوں کا کیا تعلق ہے؟ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ پیشگوئیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک علم ازلی کے اظہار کے لئے اور ایک قدرت کے اظہار کے لئے۔ تقدیر کے اس پہلو کے نہ سمجھنے کی وجہ سے عام مسلمانوں نے اسی طرح بڑے بڑے دھوکے کھائے ہیں جس طرح تقدیر کے ایک اور پہلو کو نہ سمجھنے سے ہندوؤں نے۔ اہل ہنود کا تناسخ کا مسئلہ بھی تقدیر کے نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ وہ کہتے ہیں ایک بچہ کیوں اندھا پیدا ہوتا ہے؟ اسی لئے کہ اس نے پہلے کچھ ایسے کام کئے تھے جن کی سزا اسے دی گئی۔ حالانکہ بات یہ ہے کہ تقدیر دو قسم کی ہے ایک شرعی اور دوسری طبعی۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک بچہ لولا لنگڑا کیوں پیدا ہوتا ہے؟ کیا خدا ظالم ہے کہ بلا قصور اس کو عیب دار پیدا کر دیتا ہے؟ اس سے وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس نے ضرور کسی پہلے زمانہ میں ایسے عمل کئے ہوں گے جن کی سزا میں اسے ایسا بنایا گیا ہے۔ مگر یہ دھوکا انہیں دو غلطیوں کی وجہ سے لگا ہے۔ اول یہ کہ انہوں نے تقدیر کی اقسام کو نہیں سمجھا۔ تقدیر جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں دو قسم کی ہوتی ہے ایک طبعی اور ایک شرعی۔ شرعی تقدیر کا

اثر شرعی احکام کے بجالانے یا ان کے توڑنے پر ظاہر ہوتا ہے اور طبعی تقدیر کا اثر اس کے احکام کے بجالانے یا ان کے توڑنے پر ظاہر ہوتا ہے۔ بچے جو اندھے پیدا ہوتے ہیں یا اپاہج پیدا ہوتے ہیں وہ شرعی تقدیر نہیں بلکہ طبعی تقدیر کے ٹوٹنے کی وجہ سے اندھے یا اپاہج ہوتے ہیں۔ طب سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ماں باپ کے پرہیز کا اثر بھی اور ان کی بدپرہیزی کا اثر بھی بچوں پر پڑتا ہے۔ بعض عورتوں کے رحم میں کمزوری ہوتی ہے تو ان کے بچے ہمیشہ اپاہج اور عیب دار پیدا ہوتے ہیں۔ خصوصاً بعض بیماریاں تو بچوں پر بہت ہی برا اثر کرتی ہیں۔ مثلاً سل' خنازیری مادہ' آتشک' ہسٹیریا' جنون وغیرہ۔ پس بچہ کا عیب دار اور ناقص ہونا کسی پچھلے گناہ کی سزا میں نہیں ہوتا بلکہ اس کے ماں باپ کے کسی جسمانی نقص کی وجہ سے ہوتا ہے یا ایام حمل کی بعض بدپرہیزیوں کے سبب سے ہوتا ہے۔ اور چونکہ بچہ کی پیدائش ماں باپ کے ہی جسم سے ہوتی ہے اس لئے ان کے جسمانی عیوب یا جسمانی خوبیوں کا وارث ہونا اس کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ بچہ ماں باپ کے اثر سے تبھی متأثر نہ ہو گا جب خدا تعالیٰ قانون قدرت کو اس طرح بدل دے کہ ایک شخص کے کام کا اثر دوسرے پر نہ پڑے۔ اور اگر یہ قانون جاری ہو جائے تو سمجھ لو کہ موجودہ کارخانہ عالم بالکل درہم برہم ہو جائے۔ کیونکہ تمام کارخانہ عالم اسی قانون پر چل رہا ہے کہ ایک چیز دوسری کے نیک یا بد اثر کو قبول کرتی ہے۔

دوسری وجہ جس سے اہل ہنود کو اس مسئلہ کے سمجھنے میں غلطی لگی ہے یہ ہے کہ انہوں نے خیال کیا ہے کہ روحیں کہیں جمع کر کے رکھی ہوئی ہیں اور اللہ تعالیٰ پکڑ پکڑ کر ان کو عورتوں کے رحم میں ڈالتا ہے۔ حالانکہ اس سے بیہودہ عقیدہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس عقیدہ کو مان کر پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسان کے اعمال بھی اللہ تعالیٰ ہی کرواتا ہے۔ کیونکہ ایک روح کے جسم میں آنے کا اگر وقت آگیا اور اس وقت وہ شخص جس کا پیدا کرنا منظور ہو وہ کہیں سفر پر گیا ہؤا ہو یا اس نے شادی ہی نہ کی ہو تو پھر وہ روح کیونکر آسکتی ہے۔ پس اس عقیدہ کے ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ تمام اعمال انسان سے اللہ تعالیٰ ہی کراتا ہے اور تمام دنیاوی اعمال بھی خدا تعالیٰ کے حکم سے مجبور ہو کر اسے کرنے پڑتے ہیں۔ اور اس طرح انسان کی وہ آزادیٔ عمل جس کی وجہ سے وہ جزاء و سزا کا مستحق ہوتا ہے برباد ہو جاتی ہے۔ دوسرا نقص اس عقیدہ کی وجہ سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے ایک مشاہدہ شدہ امر کا انکار کرنا پڑتا ہے اور وہ یہ ہے کہ درحقیقت روح نتیجہ ہے اس تغیر کا جو نطفہ رحم مادر میں پاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس

تغیر کے نقص کی وجہ سے بچہ بے جان رہتا ہے یا جان پڑ کر پھر رحم مادر ہی میں نکل جاتی ہے۔ پس اس عقیدہ کو مان کر کہ ارواح خدا تعالیٰ نے جمع کر کے رکھی ہوئی ہیں۔ اس مشاہدہ کا بھی انکار کرنا پڑتا ہے اور مشاہدات کا انکار ایک عقلمند انسان کے لئے بالکل ناممکن ہے۔ (اس مسئلہ کی تفصیل حضرت صاحبؑ کی کتاب براہین احمدیہ حصہ پنجم میں ضرور دیکھنی چاہئے)

عام مسلمانوں کو بھی پیشگوئیوں کو سمجھنے میں ایسا ہی دھوکا لگا ہے مگر ہندوؤں کو تقدیر طبعی اور تقدیر شرعی میں فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے دھوکا لگا ہے اور مسلمانوں کو علم الٰہی اور تقدیر الٰہی میں فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے دھوکا لگا ہے کیونکہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں جس طرح تقدیر دو قسم کی ہوتی ہے۔ اسی طرح پیشگوئیاں بھی دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک پیشگوئیاں وہ ہوتی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے ازلی علم کو ظاہر کیا جاتا ہے اور دوسری وہ پیشگوئیاں ہوتی ہیں جن میں خدا تعالیٰ کی قدرت کے ماتحت ایک حکم کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جو پیشگوئیاں کہ علم ازلی کے ماتحت ہوتی ہیں وہ کبھی نہیں ٹلتیں۔ کیونکہ اگر وہ ٹل جائیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ خدا کا علم ناقص ہو گیا۔ لیکن وہ پیشگوئیاں جو خدا تعالیٰ کی قدرت اور طاقت کے اظہار کے لئے ہوتی ہیں وہ کبھی ٹل بھی جاتی ہیں اور جو پیشگوئیاں ٹلتی ہیں وہ وہی ہوتی ہیں جو خدا تعالیٰ کی صفت قدیر کے ماتحت ہوتی ہیں۔ اور جو صفت علیم کے ماتحت ہوتی ہیں وہ کبھی نہیں ٹلتیں۔

**پیشگوئیاں کیوں ٹلتی ہیں؟** جو پیشگوئیاں ٹلتی ہیں ان کی کئی قسمیں ہیں۔

(۱) یہ کہ جن حالات میں سے انسان گزر رہا ہے ان کے نتیجہ سے انسان کو اطلاع دی جاتی ہے۔

یعنی تقدیر عام کے ماتحت جو نتائج نکلتے ہوں ان سے اطلاع دی جاتی ہے مثلاً ایک شخص ہے جو ایسی جگہ جا رہا ہے جہاں طاعون کے کیڑے ہوں۔ اور اس کے جسم میں ان کو قبول کرنے کی طاقت بھی ہو اور کوئی ایسے سامان بھی نہ ہوں جن کو استعمال کر کے وہ ان کے اثر سے بچ سکتا ہو اسے خدا تعالیٰ یہ خبر ایسے رنگ میں دے کہ وہ شخص دیکھے کہ اس کو طاعون ہو گئی ہے تا وہ اس نظارہ سے متأثر ہو کر ایسی جگہ جانے کا ارادہ چھوڑ دے جہاں طاعون ہے یا اگر ایسی جگہ موجود ہے تو ان احتیاطوں کو برتنا شروع کر دے جن سے طاعون کی روک تھام ہو سکتی ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ طاعون سے بچ جائے گا۔ اور اس کی رؤیا جھوٹی نہ کہلائے گی بلکہ بالکل سچی ہو گی۔

(۲) دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان کے روحانی یا اخلاقی حالات کے ماتحت جو تقدیر خاص جاری ہونی ہو اس سے اطلاع دے دی جاتی ہے۔

(۳) تقدیر مبرم یعنی اٹل تقدیر سے اطلاع دی جاتی ہے۔

ان تینوں صورتوں میں سے اول الذکر اور ثانی الذکر تو کثرت سے بدل جاتی ہیں لیکن آخری تقدیر نہیں بدلتی۔ ہاں کبھی کبھی خاص حالات میں وہ بھی بدل جاتی ہے۔

اب میں بتاتا ہوں کہ پہلی پیشگوئی کیوں اور کس طرح بدلتی ہے؟ سو یاد رکھنا چاہئے کہ پیشگوئی نام ہے اظہار تقدیر کا۔ یعنی جو کچھ کسی شخص کے طبعی حالات یا شرعی حالات کے مناسب حال معاملہ ہونا ہوتا ہے اسے اگر ظاہر کر دیا جائے تو اسے پیشگوئی کہتے ہیں۔ اس حقیقت کو مدِّ نظر رکھ کر اب دیکھنا چاہئے کہ پہلی قسم پیشگوئی کی یہ تھی کہ کسی شخص کو اس کے طبعی حالات کا نتیجہ بتا دیا جائے۔ مثلاً یہ بتا دیا جائے کہ اس وقت اس کی جسمانی صحت ایسی ہے کہ اس کا نتیجہ موت ہو گا۔ اب فرض کرو کہ اس کو یہ خبر نہ دی جاتی اور وہ اپنی جسمانی صحت کا فکر کرنے لگ جاتا اور احتیاط برتنی شروع کر دیتا تو کیا اس نتیجہ سے بچ جاتا یا نہیں۔ پھر اگر خدا تعالیٰ نے اسے قبل از وقت خبر دے دی تو اس کا وہ حق جو بصورت تبدیلی حالت اس کو حاصل تھا کسی وجہ سے ضائع ہو گیا۔ ضرور ہے کہ اگر وہ پورے طور پر ان ذرائع کو استعمال کرے جن سے ان حالات کو جن کے بدنتائج اس کو پہنچنے والے ہیں وہ بدل سکے تو پھر وہ مصیبت سے بچ جائے اور ہلاکت سے محفوظ ہو جائے۔

تقدیر عام کے ماتحت ہونے والے واقعات تقدیر خاص کے ماتحت بھی بدل جاتے ہیں۔ پس کبھی وہ پیشگوئی جو تقدیر عام کے ماتحت کی گئی تھی۔ تقدیر خاص سے بھی ٹل سکتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کو بتایا جائے کہ اس کے گھر میں کوئی موت ہونے والی ہے۔ اور وہ خاص طور پر صدقہ اور دعا سے کام لے تو بالکل ممکن ہے کہ وہ موت ٹل جاوے۔ اس قسم کی پیشگوئی کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایسی جگہ جا رہا ہو جس کا حال اسے معلوم نہ ہو اور سخت تاریکی ہو کچھ نظر نہ آتا ہو اور اس کے سامنے ایک گڑھا ہو جس میں اس کا گر جانا اگر وہ اپنے راستہ پر چلتا جائے یقینی ہو۔ اور ایک واقف شخص اسے دیکھ کر کہے کہ میاں کہاں جاتے ہو گر دو گے یا یہ فقرہ کہے کہ تمہاری موت آئی ہے۔ اس پر وہ شخص گڑھے تک جا کر واپس آجائے اور آکر اس شخص کو کہے کہ تم بڑے جھوٹے ہو میں تو نہیں گرا اور نہیں مرا۔ وہ یہی کہے گا کہ اگر تم جاتے

تو گرتے۔ جب گئے نہیں تو گرتے کیوں؟ اور دوسرے لوگ بھی ایسے شخص کو ملامت کریں گے کہ کیا اسے جھوٹ کہتے ہیں۔ تو اپنی جان بچانے کے احسان کا بدلہ اس نامعقول طور پر دیتا ہے۔ یہ تو تقدیر عام کو تقدیر عام سے بدلنے کی مثال ہے۔ اور تقدیر خاص کی مثال یہ ہے کہ مثلاً وہ شخص جسے دوسرے آدمی نے کہا تھا کہ تو مرے گا' یا گرے گا' وہ اس تنبیہہ کرنے والے شخص کو کہے کہ مجھے کام ضروری ہے مہربانی فرما کر کوئی مدد ہو سکے تو کرو۔ اور وہ تنبیہہ کرنے والا شخص کوئی بڑا تختہ لا کر گڑھے پر رکھ دے جس پر سے وہ گزر جائے۔ کیا اس صورت میں بھی یہ ممکن ہے کہ اس شخص کو کوئی کہے کہ تم نے جھوٹ بولا تھا۔ یہ شخص تو گڑھے پر سے سلامت گزر آیا۔ اس میں کیا شک ہے کہ اگر وہ شخص اطلاع نہ دیتا تو یہ اندھیرے کی وجہ سے گڑھے میں گر کر ہلاک ہو جاتا۔ اور اگر وہ مدد نہ کرتا تو یہ گڑھے پر سے کبھی پار نہ ہو سکتا۔

اسی طرح کبھی اللہ تعالیٰ بھی خبر دیتا ہے کہ فلاں مصیبت فلاں شخص پر آنے والی ہے اور اس سے غرض اس شخص یا اس کے رشتہ داروں کو متنبہ کرنا ہوتا ہے کہ ان کے موجودہ حالات کا نتیجہ اس طرح نکلنے والا ہے۔ جب وہ ان حالات کو بدل دیتے ہیں یا حالات نہیں بدل سکتے تو خدا تعالیٰ سے عاجزانہ طور پر اس کی مدد چاہتے ہیں تو پھر وہ مصیبت بھی ٹل جاتی ہے۔ اور کوئی عقلمند انسان اس اطلاع کو جھوٹی نہیں کہہ سکتا نہ خدا تعالیٰ پر جھوٹ کا الزام لگا سکتا ہے۔

دوسری پیشگوئی وہ ہوتی ہے جس میں تقدیر خاص کی اطلاع کسی بندے کو دے دی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص ہے جس نے شرارت میں حد سے زیادہ ترقی کی ہے اور لوگ اس کے ظلموں سے تنگ آگئے ہیں اور خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کی شرارت کی سزا اسی دنیا میں اسے دے اور ملائکہ کو حکم دیتا ہے کہ مثلاً اس کے مال و جان کو نقصان پہنچاؤ یا اس کی عزت تباہ کر دو۔ اس حکم کی اطلاع کبھی وہ اپنے کسی بندے کو بھی دے دیتا ہے۔ اس خبر کو سن کر وہ شریر آدمی جو اپنے دل کے کسی گوشے میں ایک چنگاری خشیت الٰہی کی بھی رکھتا تھا جو گناہوں کی راکھ کے نیچے دبی پڑی تھی گھبرا کر اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے اور اس توجہ کے زمانے میں اس چنگاری کی گرمی کو محسوس کرتا ہے اور اسے راکھ کے ڈھیر کے نیچے سے نکال کر دیکھتا ہے۔ وہ چنگاری راکھ سے باہر آکر زندہ ہو جاتی ہے۔ اور روشنی اور گرمی میں ترقی کرنے لگ جاتی ہے اور اسی شخص کے دل میں نئی کیفیتیں اور نئی امنگیں پیدا کرنے لگتی ہے۔ اور وہ جو چند دن پہلے شریر اور مفسد تھا اپنے اندر محبت اور خشیت الٰہی کی گرمی محسوس کرنے لگتا ہے اور اپنے پچھلے افعال

پر نادم ہو کر اپنے رب کی دہلیز پر اپنی جبیں (پیشانی) کو رکھ دیتا ہے اور ندامت کے آنسوؤں سے اس کو دھو دیتا ہے۔ کیا رحمٰن اور رحیم خدا اس کی اس حالت کو دیکھ کر اس کے اس حال پر رحم کھائے گا یا نہیں؟ کیا وہ اپنے پہلے فیصلہ کو جو اس شخص کے پہلے حال کے مطابق اور ضروری تھا اب نئے حال کے مطابق بدلے گا یا نہیں؟ کیا وہ رحم سے کام لے کر اس کی سزا کے حکم کو منسوخ کرے گا یا کہہ دے گا کہ چونکہ میں اپنے فیصلہ سے ایک بندہ کو بھی اطلاع دے چکا ہوں اس لئے میں اب اس حکم کو نہیں بدلوں گا اور خواہ یہ شخص کس قدر بھی توبہ کرے گا اس کی حالت پر رحم نہیں کروں گا۔ کیا اگر وہ اپنے فیصلہ کو ظاہر نہ کرتا تو اسلامی تعلیم کے ماتحت اس فیصلہ کو بدل سکتا تھا یا نہیں؟ بلکہ وہ اپنی سنت کے مطابق اس کو بدل دیتا یا نہیں؟ پھر جب کہ وہ باوجود ایک فیصلہ کر دینے کے باوجود ملائکہ کو اس پر آگاہ کر دینے کے اپنے فیصلہ کو بدل سکتا تھا بلکہ بدل دیتا تو کیا وہ اب اس لئے رحم کرنا چھوڑ دے گا کہ اس نے اپنا فیصلہ ملائکہ کے علاوہ ایک انسان پر بھی ظاہر کر دیا ہے اور اس کے ذریعہ دوسرے انسانوں کو بھی اطلاع دے دی ہے اور کیا وہ اپنے فیصلہ کو بدل دے تو کوئی نادان کہہ سکتا ہے کہ اس نے نعوذ باللہ جھوٹ بولا ہے؟ ایک ملازم کے قصور پر اگر کوئی آقا کہے کہ میں تجھے ماروں گا۔ اور وہ ملازم سخت ندامت کا اظہار کرے اور توبہ کرے اور آئندہ کے لئے اصلاح کا وعدہ کرے اور وہ آقا اسے معاف کر دے اور نہ مارے تو کیا کوئی صحیح العقل انسان کہے گا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے؟ اور وعدہ خلافی کی ہے؟

پہلی قسم کی پیشگوئیاں یعنی جن میں تقدیر عام کے نتائج سے اطلاع دی جاتی ہے اکثر مؤمنوں کے لئے ہوتی ہیں تا اللہ تعالیٰ ان کو ہوشیار اور متنبہ کر دے اور آفات ارضی سے بچالے اور ان پر اپنے رحم کو کامل کرے کیونکہ مؤمن قانون قدرت کے اثر سے بالا نہیں ہوتا۔ اور بارہا لاعلمی کی وجہ سے ان کی زد میں آجاتا ہے اور طبعی قوانین کو توڑ کر مشکل میں پھنس جاتا ہے۔ تب خدا تعالیٰ نتائج بد کے پیدا ہونے سے پہلے اسے یا کسی اور مؤمن کو اس کے لئے اصل حالت سے آگاہ کر دیتا ہے۔ اور وہ خود قانون قدرت کے ہی ذریعہ سے یا دعا و صدقہ سے اس کا دفعیہ کر لیتا ہے۔ اور دوسری قسم کی پیشگوئیاں جن میں تقدیر خاص کے ذریعہ سے کسی شخص کی نسبت حکم ہوتا ہے۔ خاص سرکشوں اور مفسدوں کے لئے ہوتی ہیں اور اس کی یہ وجہ ہے کہ اس تقدیر کے ماتحت ٹلنے والی پیشگوئی ہمیشہ عذاب کی ہوتی ہے کیونکہ عذاب ہی کی پیشگوئی ہمیشہ

ٹلا کرتی ہے وعدہ کی نہیں۔ کیونکہ اس پیشگوئی کا ٹلنا رحم کا موجب ہوتا ہے اور اس سے خدا تعالیٰ کی شان ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن جو مؤمن کے حق میں تقدیر خاص ظاہر ہوتی ہے وہ چونکہ وعدہ ہوتی ہے وہ نہیں ٹلتی۔ کیونکہ اس کے ٹلنے سے اظہار شان نہیں ہوتی۔ اور اس لئے بھی کہ وعید ہمیشہ کسی سبب سے ہوتا ہے۔ اور اس سبب کے بدلنے سے بدل سکتا ہے۔ اور وعدہ کبھی بلا سبب بھی ہوتا ہے اس لئے وہ نہیں ٹل سکتا کیونکہ جس چیز کو اپنے طور پر بلا خدمت کے دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے اسے کسی اور سبب سے روک دینا خدا تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔

**تقدیر مبرم**

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ تقدیر مبرم سوائے خاص حالات کے نہیں ٹلا کرتی۔ اور اب میں بتاتا ہوں کہ تقدیر مبرم کے ٹلنے سے کیا مراد ہے۔ تقدیر مبرم کے ٹلنے سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ واقع میں کلی طور پر ٹل جاتی ہے۔ بلکہ اس کے ٹلنے سے صرف یہ مراد ہے کہ اس کی شکل بدل جاتی ہے اور اسے کسی اور رنگ میں بدل دیا جاتا ہے۔ یہ تقدیر باریک در باریک رازوں کے ماتحت نازل ہوتی ہے۔ اور اس کے بدلنے سے بعض دفعہ اور بہت سے قوانین پر اثر پڑتا اور بدانتظامی ہوتی ہے۔ پس یہ تقدیر اللہ تعالیٰ کی خاص حکمتوں کے ماتحت کلی طور پر ٹلائی نہیں جاتی۔ اور اگر ٹلتی ہے تو شفاعت کے ماتحت ٹلتی ہے جو ایک خاص مقام ہے اور جب سے دنیا قائم ہوئی ہے صرف چند بار ہی اس مقام پر خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو قائم کیا ہے۔

اس تقدیر کے جزئی طور پر ٹل جانے کی مثال حضرت سید عبدالقادر صاحب جیلانیؒ کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں آپؒ کا ایک مرید تھا جس سے انہیں بہت محبت تھی۔ اس کے متعلق انہیں خبر دی گئی کہ وہ ضرور زنا کرے گا اور یہ تقدیر مبرم ہے۔ انہوں نے اس کے متعلق متواتر دعا کرنی شروع کی اور ایک لمبے عرصہ کے بعد ان کو اطلاع ملی کہ ہم نے اپنی بات بھی پوری کر دی اور تیری دعا کو بھی سن لیا۔ وہ حیران ہوئے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ جب وہ مرید ملنے آیا تو انہوں نے اس کو سب حال بتایا کہ اس طرح مجھے تیری نسبت اطلاع ملی تھی۔ میں نے تجھے بتایا نہیں اور دعا کرتا رہا۔ اب یہ خبر ملی ہے کیا بات ہے؟ اس نے بتایا کہ ایک عورت پر میں عاشق ہو گیا تھا۔ نکاح کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ آخر فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہی ہو اس سے زنا ہی کرلوں گا۔ اسی کوشش میں تھا کہ رات کو رؤیا میں وہ نظر آئی اور میں اس سے ہم

صحبت ہؤا۔ آنکھ کھلنے پر معلوم ہؤا کہ دل سے اس کی محبت بالکل نکل گئی اور وہ حالت جاتی رہی۔ اس اظہار واقعہ سے سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کو معلوم ہؤا کہ کس طرح وہ تقدیر جو اس شخص کے اپنے ہی اعمال کے نتیجہ میں ظاہر ہونے والی تھی اور اس کے لئے ایسے حالات جمع ہو گئے تھے کہ وہ ٹل نہیں سکتی تھی خدا تعالیٰ نے ایک اور صورت میں پوری کر کے اس شخص کو گناہ سے بچا دیا۔ اور سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کی دعا کو اس کے حق میں قبول کر کے اپنی خاص قدرت کے ذریعہ سے اس شخص کو اس کے برے اعمال کے بد نتائج سے بچا لیا۔

## کیا تقدیر کے ٹلنے سے کوئی نقص تو واقع نہیں ہوتا؟

اب سوال ہوتا ہے کہ تقدیر کے ٹلنے سے خدا کی شان میں فرق نہیں آتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں آتا۔ کیونکہ تقدیر کے ٹلانے میں کئی ایک فوائد ہیں۔ اول تقدیر کے بتلانے اور پھر اس کو ٹلانے سے اللہ تعالیٰ کی شفقت کا اظہار ہوتا ہے۔ کیونکہ جب وہ ایک آنے والی مصیبت کا اظہار بندہ پر کر دیتا ہے تو اس سے بندہ ہوشیار ہو جاتا ہے اور اپنے بچاؤ کے سامان کر لیتا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے احسان سے اس مصیبت سے بچ جاتا ہے۔ پس تقدیر کا قبل از وقت بتانا بھی اللہ تعالیٰ کی شفقت پر دلالت کرتا ہے اور پھر اس کا ٹلانا بھی اس کے رحم پر دلالت کرتا ہے اور بجائے نقص کے اس میں فائدہ ہے۔

تقدیر خاص کے ٹلانے میں کہ جو تقدیر عام کے نتیجہ میں نازل نہیں ہوتی بلکہ روحانی حالت کے تغیر پر اس کا نزول ہوتا ہے ایک اور فائدہ بھی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہے۔ اگر غور کیا جائے تو تقدیر خاص کو ٹلانے کے بغیر اللہ تعالیٰ کی کامل قدرت کا اظہار ہی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص انبیاءؑ کی مخالفت کرے اور دین حق کے پھیلنے میں روک ہو اور اس کو سزا دینا ضروری ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اطلاع اپنے مأمور کو مل جائے کہ وہ شخص ہلاک ہو جائے گا اور وہ شخص باوجود توبہ کے ہلاک ہو جائے تو اس سے خدا تعالیٰ کا قادر ہونا مخفی ہو جائے گا اور زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہو گا کہ خدا تعالیٰ علیم ہے۔ لیکن علیم ہونا کوئی چیز نہیں جب تک وہ قادر بھی نہ ہو۔ اس کا قادر ہونا ہی انسان کی محبت کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ پس ایک خبر کے بتائے جانے پر پھر اس کا نہ ٹلنا صرف علم غیب پر دلالت کرے گا قدرت پر نہیں۔ بلکہ لوگوں کو شبہ پڑ سکے گا کہ جو نبیؑ خبر بتا رہا ہے شاید اسے کوئی ایسا ذریعہ معلوم ہو گیا ہے جس کے

ذریعے وہ غیب کی خبر معلوم کر سکتا ہو۔ لیکن جب ایک حکم خاص حالات کے بدلنے پر ٹل جاتا ہے تو صاف ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ حکم ایک قادر ہستی کی طرف سے ہے جو ہر ایک مناسب حالت کے مطابق حکم دیتی ہے جیسا جیسا انسان اپنے حال کو بدلتا رہتا ہے وہ بھی اپنی تقدیر کو اس کے لئے بدلتی جاتی ہے۔ اور اس سے اس کی شوکت اور جلال کا اظہار ہوتا ہے اور بندہ کی امید بڑھتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر وہ پکڑتا ہے تو چھوڑ بھی سکتا ہے اور ایک مشین کی طرح نہیں ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص بھی نظر انصاف سے دیکھے گا تو اسے معلوم ہو گا کہ اگر انذاری پیشگوئیاں نہ ٹلیں تو خدا تعالیٰ کا قادر ہونا ہرگز ثابت نہ ہو۔ بلکہ یہ معلوم ہو کہ گویا وہ نعوذ باللہ ایک بیلنے کی طرح ہے۔ اگر اس میں گنا ڈالا جاتا ہے تو اسے بھی پیل دیتا ہے اور اگر اس کے آقا کا ہاتھ پڑ جائے تو اسے بھی پیل دیتا ہے۔ خواہ کوئی کتنی ہی توبہ کرے اس کا حکم اٹل ہوتا ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ اس کی دشمنی ترک کر کے اس کی دوستی کا اختیار کرنا کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

شاید اس جگہ کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ اگر اسی طرح پیشگوئیاں بدل جاویں تو ان کی سچائی کا کیا ثبوت ہو؟ پھر کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو پیشگوئیاں مخفی اسباب پر دلالت کرتی ہیں یعنی ان میں ایسی باتیں بتائی جاتی ہیں جن کے اسباب ظاہر میں موجود نہیں ہوتے اور قیاس اور ظن انہی باتوں میں چلتا ہے جن کے اسباب ظاہر ہوں۔ مثلاً ایک شخص بیمار ہو اور اس کی نسبت یہ بتایا جائے کہ وہ مر جائے گا تو اس میں قیاس کا دخل ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسی خبر دی جائے جس کے اسباب ہی موجود نہ ہوں اور پھر اس کے آثار ظاہر ہو جائیں تو پھر خواہ وہ ٹل ہی جائے اسے قیاسی خبر نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس کے ایک حصہ نے اس کے دوسرے حصہ کی صداقت پر مہر لگا دی ہے۔ پس باوجود پیشگوئیوں کے ٹلنے کے ان کی صداقت میں شبہ پیدا نہیں ہو سکتا اور وہ پھر بھی دنیا کی ہدایت کے لئے کافی ہوتی ہیں۔

دوسرا جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ انذاری پیشگوئیاں تو اکثر دشمنوں کے لئے ہوتی ہیں اور دشمن بالعموم ضدی اور اپنے خصم پر تمسخر اڑانے والا ہوتا ہے اور اس کے قبل از وقت ڈرانے سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے۔ ایسے تو بہت ہی کم ہوتے ہیں جو انذار سے فائدہ اٹھائیں اور ان پر سے عذاب ٹل جائے۔ پس مثلاً پانچ یا دس فیصدی انذاری پیشگوئیوں کے ٹل جانے

سے کس طرح شبہ پڑ سکتا ہے جب کہ اس کے بالمقابل تمام کی تمام وعدہ والی پیشگوئیاں اور نوے یا پچانوے فیصدی انذاری پیشگوئیاں پوری ہو کر روز روشن کی طرح اس پیشگوئی کرنے والے کی صداقت کی تصدیق کر رہی ہوتی ہیں۔

تیسرے تقدیر خاص کے ماتحت جو خبریں دی جاتی ہیں اور انہی کے متعلق مخالفوں کو زیادہ شبہ پڑتا ہے یہ طبعی امور کے نتیجہ میں نہیں ہوتیں بلکہ روحانی امور کے نتیجہ میں ہوتی ہیں۔ مثلاً لیکھرام کے متعلق جو خبر دی گئی کہ رسول کریم ﷺ کی گستاخی کی سزا میں وہ قتل کیا جائے گا یا آتھم کی نسبت کہ وہ آپ ؐ کی گستاخی کی سزا میں ہاویہ میں گرایا جائے گا یا احمد بیگ اور اس کے داماد کے متعلق کہ وہ مرجائیں گے۔ تو یہ سزائیں کسی طبعی امر کے نتیجہ میں نہیں تھیں۔ اگر لیکھرام نے کوئی قتل کیا ہؤا ہوتا اور کہا جاتا کہ وہ قتل کیا جائے گا تب اور بات تھی۔ یا اسی طرح آتھم اور احمد بیگ کے متعلق کوئی ایسی سزا تجویز کی جاتی جو طبعی امور کا نتیجہ ہوتی تب اعتراض ہو سکتا تھا۔ مگر جن جرموں کے بدلہ میں سزائیں مقرر کی گئی ہیں وہ روحانی ہیں اور ایسی اخبار میں سے اگر بعض بھی پوری ہو جائیں تو وہ اس امر کا ثبوت ہیں کہ ان کے بتانے والا خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتا تھا کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو وہ ایسی باتیں کس طرح بتا سکتا تھا جن کا ثبوت طبعی امور میں نہیں ملتا۔ روحانی گناہوں کی سزا تو اللہ تعالیٰ ہی بتا سکتا ہے۔ دوسرا شخص ایک روحانی گناہ گار کو دیکھ کر کیا بتا سکتا ہے کہ اسے سزا کس رنگ میں ملے گی؟

اگر یہ کہا جائے کہ یہ جو تم نے بیان کیا ہے کہ بہت دفعہ ایک خبر جو دی جاتی ہے وہ موجودہ حالات کا نقشہ ہوتی ہے یعنی اس میں بتایا جاتا ہے کہ اس وقت جن حالات میں سے یہ گزر رہا ہے ان کا یہ نتیجہ ہو گا تو کیوں نہیں صاف صاف یہ بتا دیا جاتا کہ تمہاری یا فلاں شخص کی موجودہ حالت کا یہ نتیجہ ہے تاکہ لوگوں کو خوابوں اور الہاموں پر شبہ نہ پڑے۔ اگر اسی طرح صاف صاف بتا دیا جائے تو پھر لوگوں کو کوئی ابتلاء نہ آئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو جن لوگوں کے دل میں مرض ہوتی ہے ان کو ہر حالت میں شبہ پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت صاحب ؑ کی جن پیشگوئیوں میں صاف طور پر یہ شرط بتا دی گئی تھی ان پر بھی لوگ معترض ہیں۔ طاعون کی پیشگوئی میں صاف کہہ دیا گیا تھا کہ قادیان میں ایسی طاعون نہ پڑے گی کہ دوسرے گاؤں کی طرح اس میں تباہی آجائے مگر پھر بھی لوگ اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک کیس بھی یہاں نہ ہونا چاہئے تھا۔ دوسرے اس طریق کے اختیار کرنے میں ایک فائدہ بھی ہے

اور وہ یہ کہ اس ذریعہ سے وہ اصل غرض جس کے لئے خواب یا الہام ہوتا ہے زیادہ اچھی طرح پوری ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ منذر خواب یا الہام جن میں آئندہ کی کوئی خبر بتائی جاتی ہے ان میں علاوہ اور اغراض کے ایک غرض یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ بندہ جس کے متعلق اس خواب یا الہام میں کوئی خبر دی گئی ہے۔ ہوشیار ہو جائے اور اپنی اصلاح کی فکر کرے اور اگر اصلاح نہ کرے تو اس پر حجت قائم ہو جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

رُسُلاً مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلاَّ يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ

(النساء:۱۶۶)

یعنی ہم نے مذکورہ بالا رسولوں کو (جن کا اس آیت میں پہلے ذکر ہؤا ہے) بھیجا بشارت دیتے ہوئے اور منکروں کو ڈراتے ہوئے تاکہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر کوئی حجت نہ رہے۔

غرض انذاری پیشگوئیاں حجت کے قیام کے لئے ہوتی ہیں اور ان کے ذریعہ سے اس شخص کو جس کے خلاف وہ پیشگوئیاں کی جاتی ہیں اصلاح کا آخری موقع دیا جاتا ہے اور بصورت دیگر اس پر حجت قائم کی جاتی ہے۔ اور یہ بات ثابت ہے کہ اگر کسی شخص کو مثلاً اس کی اپنی ذات کے متعلق یہ نظارہ دکھایا جائے کہ اس کو تپ چڑھا ہؤا ہے اور وہ خواب میں تپ کی تکلیف کو دیکھے تو اس پر اور ہی اثر ہو گا۔ بہ نسبت اس کے کہ اس کو کوئی شخص کہہ دے کہ تیرے حالات ایسے ہیں کہ تجھے تپ چڑھنے کا احتمال ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو یہ بتایا جائے کہ فلاں شخص کو اس کی بے دینی کی وجہ سے سزا کا احتمال ہے تو اس کا اور اثر ہو گا بہ نسبت اس کے کہ اس کو یہ بتایا جاوے کہ اس شخص کے لئے سزا مقدر ہو چکی ہے اور جب کہ اس کے اعمال کی وجہ سے سزا مقدر ہو بھی چکی ہو تو پھر حق بھی یہی ہو گا اور اسی رنگ میں بتایا جانا ضروری ہے۔

اگر یہ شبہ کیا جائے کہ کیوں خدا تعالیٰ وہی بات نہیں بتا دیتا جو آخر میں ہونی ہوتی ہے۔ درمیانی حالت بتاتا ہی کیوں ہے کہ لوگ شبہ میں پڑ جاویں۔ تو اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں پیشگوئیوں کی غرض اصلاح ہوتی ہے۔ پس اگر تقدیر کا وہ پہلو بتایا ہی نہ جاوے جس نے بدل جانا ہے تو لوگوں کو اصلاح کی تحریک کس طرح کی جائے؟ درحقیقت تقدیر کے اس قسم کے اظہار سے ہزاروں آدمیوں کی جان بچ جاتی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کا رحم اس کا محرک ہے۔ دوسرے جیسا کہ میں پہلے بتا آیا ہوں اللہ تعالیٰ کی دو صفات ہیں ایک علیم ہونا اور ایک قادر ہونا۔ اگر تقدیر کا وہی حصہ بتایا جائے جو بدلتا ہی نہیں تو اس سے خدا تعالیٰ کا

علیم ہونا تو ثابت ہو جاتا مگر قادر ہونا ثابت نہ ہوتا۔ پس ایسی تقدیر کا ظاہر کرنا جو موجودہ حالات کے مطابق ہے خدا تعالیٰ کی قدرت کے اظہار کے لئے ضروری ہے۔ اس کے بغیر انسان پر اس کی قدرت کا کامل اظہار نہیں ہو سکتا۔ یہی ایک ذریعہ انسان پر قدرت الٰہی کے اظہار کا ہے کہ اس کے روحانی حالات پر خدا تعالیٰ کا ایک حکم جاری ہو اور اگر وہ حالات قائم رہیں تو اس کے ساتھ اس اظہار کے مطابق معاملہ ہو اور اگر بدل جاویں تو اس کے ساتھ معاملہ بھی بدل جاوے۔

اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ لوگوں کو ایسی پیشگوئیوں سے ابتلاء آجاتا ہے یہی بہتر تھا کہ خدا تعالیٰ اس قسم کی اخبار نہ دیا کرتا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شریر اور مفسد کی شرارت سے ڈر کر اللہ تعالیٰ حق کو نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ بات جس سے اللہ تعالیٰ کے رحم کا اظہار اور اس کی قدرت کا ثبوت ملتا ہے اور اس کے فاعل بالارادہ ہونے کی تصدیق ہوتی ہے وہ اس کو شریروں اور مفسدوں کے اغراض کی وجہ سے کیونکر چھوڑ سکتا تھا۔ اس قسم کی اخبار دینے میں سوائے ان لوگوں کے شور کے جن کی نیت مخالفت پر پختہ ہو چکی ہوتی ہے اور کیا چیز روک ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

مَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ (بنی اسرائیل:۶۰)

یعنی کیا ہم اس وجہ سے کہ پہلے زمانوں میں شریر لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کر دی تھی آیات کا بھیجنا بند کر دیں گے؟

پس یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے کہ وہ بات جو اس کے رحم اور اس کی قدرت کا اظہار سمجھدار لوگوں پر کرتی ہے اس کو اس لئے ترک کر دے کہ شریر کو اس پر ٹھوکر لگتی ہے۔ شریر کو ٹھوکر کیا لگنی ہے وہ تو پہلے ہی سے ٹھوکر کھا رہا ہوتا ہے۔ پس اس کے خیال سے مؤمنوں کو فائدہ سے کیوں محروم رکھا جائے؟

میں اس جگہ ان لوگوں کی ہدایت کے لئے جو مسلمان کہلاتے ہوئے ایسی پیشگوئیوں پر معترض ہوتے ہیں خود اسلام میں سے بعض ایسی مثالیں بیان کر دیتا ہوں جن میں خدا تعالیٰ نے آخری امر کو بیان نہیں فرمایا بلکہ تدریجاً اپنے منشاء کا اظہار کیا ہے یا یہ کہ ہر ایک حالت کے مطابق اس کا انجام بتایا ہے۔ ایک مثال اس کی تو وہ عظیم الشان واقعہ ہے جو مسلمانوں میں معراج کے نام سے مشہور ہے اور جس کا تعلق اسلام کی بنیاد سے ایسا ہے کہ کوئی ذی علم مسلمان

اسے نظرانداز نہیں کر سکتا۔ معراج کے ذکر میں رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ پہلے آپ کو پچاس نمازوں کا حکم ہؤا۔ اور پھر حضرت موسیٰؑ کے مشورہ سے آپؐ نے بار بار عرض کر کے پانچ نمازوں کا حکم لیا۔ (مسلم کتاب الایمان باب الاسراء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی السمٰوٰت و فرض الصلوات) اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قبل از وقت معلوم تھا کہ اس طرح حضرت موسیٰؑ کہیں گے اور اس طرح ان کے مشورہ سے محمد رسول اللہ ﷺ مجھ سے تخفیف کی درخواست کریں گے۔ پس سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں خدا تعالیٰ نے پہلے پچاس نمازوں کا حکم دیا اور بعد میں ان کو پانچ سے بدل دیا۔ کیوں نہ شروع میں ہی پانچ کا حکم دیا۔ جو اس کا جواب ہے وہی ایسی پیشگوئیوں کے بدلنے کے متعلق ہمارا جواب ہے۔

دوسری مثال اس کی وہ مشہور حدیث ہے جس میں اس شخص کا ذکر کیا گیا ہے جو سب کے آخر میں دوزخ میں رہ جاوے گا اور پھر اسے اللہ تعالیٰ اس کی خواہش کے مطابق دوزخ سے نکال کر باہر کھڑا کر دے گا اور پھر وہ ایک درخت دیکھے گا اور اس کے نیچے کھڑا ہونے کی خواہش کرے گا اور خدا تعالیٰ اس سے یہ عہد لے کر کہ وہ پھر کچھ اور طلب نہیں کرے گا اسے اس جگہ کھڑا کر دے گا۔ اور آخر ایک اور درخت کو دیکھ کر جو پہلے سے بھی زیادہ سرسبز ہو گا وہ پھر درخواست کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس کے عہد کو یاد دلا کر اور نیا عہد لے کر اس کے نیچے بھی کھڑا کر دے گا۔ آخر وہ جنت میں جانے کی خواہش کرے گا اور اللہ تعالیٰ ہنس پڑے گا اور اس کو جنت میں داخل کر دے گا۔ (مسلم کتاب الایمان باب اُخر اھل النار خروجا) اس واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ ہر ایک موقع کے مطابق خبر دیتا ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ آئندہ پھر اور خواہش نہیں کرے گا۔ اس سے یہی مفہوم سمجھا جاتا تھا کہ وہ اسے جنت میں داخل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرنا چاہتا تھا اور پھر اسے آہستہ آہستہ جنت کی طرف لے جانا اسی اعتراض کے نیچے آجاتا ہے کہ کیوں اس نے اسے ایک دفعہ ہی جنت میں داخل نہ کر دیا اور جو اس کا جواب ہو گا وہی اس قسم کی پیشگوئیوں کے بدلنے کا بھی جواب ہے۔

آخر میں مَیں پھر یہی بات کہوں گا کہ پیشگوئی محض اظہار تقدیر کا نام ہے اور یہ سب مسلمانوں کا مسلّمہ مسئلہ ہے کہ تقدیر ٹل جاتی ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ تقدیر کو چونکہ ظاہر کر دیا گیا ہے اس لئے تقدیر کے ٹلنے سے جو فائدہ انسان بصورت دیگر اٹھا سکتا ہے اس سے اسے

محروم کر دیا جائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تقدیر اور اکتساب ایک ہی وقت جاری ہوتے ہیں۔ مگر تقدیر علیحدہ علیحدہ رنگ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے جاری ہوتی ہے اس کے ساتھ بندہ کی تدبیر مل کر انسانی اعمال مکمل ہوتے ہیں۔ اور ایک تقدیر وہ ہوتی ہے جس میں بندہ کے اعمال کا بالکل دخل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ تقدیر اعمال کی جزاء کے متعلق جاری ہوتی ہے اور اگر کبھی اعمال کے متعلق جاری ہو تو ایسے اعمال کے متعلق انسان کو کسی قسم کی پُرسش نہیں ہوتی بشرطیکہ وہ اعمال بعض دوسرے اعمال کا نتیجہ اور جزاء نہ ہوں۔ حج' نماز' روزہ' زکوٰۃ وغیرہ اور جھوٹ' زنا' ڈاکہ وغیرہ سب انسان کے کام ہیں جن میں اکتساب کے طور پر اپنی مرضی کے ماتحت انسان عمل کرتا ہے اس لئے ان کے متعلق جزاء و سزا کا مستحق ہے۔

باوجود اس کے ایک نادان اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ سے خدا چوری یا زنا کراتا ہے اور نہیں جانتا کہ خدا تعالیٰ کی تقدیر بدیوں کے لئے جاری نہیں ہوتی۔ وہ پاک ہے اس لئے وہ پاک ہی کام کرائے گا۔ اگر خدا کی تقدیر جاری ہوئی ہوتی تو ہر انسان سے نیک ہی کام کراتی جیسا کہ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا (السجدۃ: ۱۴) کہ اگر ہم جبر کرتے تو سب کو مسلمان بناتے کافر کیوں بناتے۔

پس اگر خدا کا انسان پر جبر تھا تو چاہئے تھا کہ ہر ایک سے نیک ہی اعمال کراتا۔ مگر تعجب ہے کہ انسان ناپاک فعل خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا نے مجھ سے چوری کرائی میرا اس میں کیا دخل تھا؟ حالانکہ وہ ناپاک تقدیر اپنے اوپر خود جاری کرتا ہے۔ پس یہ غلط ہے کہ خدا ابھی گندی تقدیر جاری کرتا ہے تاکہ انسان برے فعل کرے۔ ہاں ایک گندی تقدیر ہے ضرور جو شیطان جاری کرتا ہے اور اس کے ماتحت اپنے چیلوں سے کام لیتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ شیطان کا تسلط ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اس سے دوستی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ چونکہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کے پیرو بن جاتے ہیں اس لئے خدا بھی ان کو چھوڑ دیتا ہے اور شیطان ان پر اپنی تقدیر جاری کرنا شروع کر دیتا ہے۔ پس وہ شخص جو برے فعل کر کے کہتا ہے کہ یہ کام مجھ سے خدا کراتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی سخت گستاخی کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو محاورہ ہے کہ جب کسی سے برا فعل سرزد ہو جاتا ہے تو کہتا ہے تقدیری امر تھا

میرا کیا بس تھا۔ یہ خدا تعالیٰ کی بے ادبی اور گستاخی ہے۔ کیونکہ یہ غلط ہے کہ برے کاموں کے متعلق خدا تعالیٰ کی تقدیر جاری ہوتی ہے۔ ہاں بری تقدیر شیطان کی طرف سے ان لوگوں پر جاری ہوتی ہے جو اس کے بندے بن جاتے ہیں اور ایک وقت ان پر ایسا آتا ہے کہ اگر اس وقت چاہیں بھی کہ شیطان کے پنجے سے نکل جائیں تو آسانی سے نہیں نکل سکتے۔ یعنی وہ ایک گناہ کو چھوڑنا چاہتے ہیں لیکن اس کا چھوڑنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر ان کی حالت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ شیطان کے پنجہ سے چھوٹنا نہیں چاہتے اور اس کے ساتھ مل جاتے ہیں۔

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسئلہ تقدیر پر اگر ہم ایمان نہ لائیں یا یہ خدا کی طرف سے جاری نہ ہو تو کیا نقصان ہوتے ہیں۔ اور اس پر ایمان لانے اور اس کے جاری ہونے کے کیا فوائد ہیں؟

یہ ایک بہت اہم سوال ہے جس پر غور کرنے کی سخت ضرورت ہے لیکن افسوس کہ ظاہری صوفی اور ملّاں اس طرف گئے ہی نہیں۔ لے

(چونکہ وقت بہت ہو گیا تھا اور سردی سخت تھی۔ نیز ابھی تقریر کا بہت سا حصہ باقی تھا۔ اس لئے بقیہ حصہ دوسرے دن پر رکھا گیا اور اسی جگہ تقریر ختم ہوئی۔ اور اس سے اگلا حصہ یہ ہے جو دوسرے دن بیان کیا گیا۔)

## مسئلہ تقدیر کے متعلق بعض شبہات کا ازالہ

میرا منشاء تھا کہ تقدیر کے مسئلہ کی تشریح بیان کرنے کے بعد اس پر ایمان لانے کے فوائد بھی آپ لوگوں کے سامنے بیان کروں اور آج اسی مضمون کو شروع کرنے کا ارادہ تھا مگر آج ایک صاحب نے کچھ سوالات لکھ کر دیئے ہیں اس لئے پہلے مختصر طور پر ان کا جواب بیان کر دیتا ہوں۔ یہ صاحب پوچھتے ہیں کہ شیطان کو گمراہ کرنے کی طاقت کہاں سے ملی؟ میں نے کل بیان کیا تھا کہ جب انسان اپنے خیالات کو شیطانی بنا لیتا ہے تب شیطان سے لگاؤ پیدا ہو جانے کی وجہ سے شیطان کو بھی اس سے تعلق ہو جاتا ہے اور وہ بھی اسے گمراہ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ پس یہ گمراہی درحقیقت خود انسان کے نفس سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ میں اس کی مثال دیتا ہوں۔ مثلاً ایک شرابی دوسرے شرابی کو اپنے ساتھ لے جائے اور وہ شخص جدھر جدھر یہ شخص شراب پینے کے لئے جاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ جائے تو گو وہ یہ کہے میں اس کا تابع ہوں

جدھر اس کی مرضی ہے لے جائے مگر دراصل وہ خود چونکہ اس کا ہم خیال ہے اور آپ شراب کا شیدائی ہے اس کے ساتھ ساتھ جاتا ہے اور اپنے مزے کا خیال کر رہا ہے۔ صاحب مثنوی؎ نے اس تعلق کو ایک لطیف مثال کے طور پر بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ایک چوہا تھا۔ اس نے ایک اونٹ کی رسی پکڑلی اور اپنے پیچھے پیچھے چلانے لگ گیا اور اس پر اس نے سمجھا کہ مجھے بڑی طاقت حاصل ہو گئی ہے کہ اونٹ جیسے قد آور جانور کو اپنے پیچھے چلا رہا ہوں اور اس پر وہ پھولا نہ سماتا تھا کہ چلتے چلتے راستہ میں دریا آگیا۔ اونٹ چونکہ پانی میں چلنے سے خوش نہیں ہوتا اس لئے جب چوہا پانی کی طرف چلا تو وہ ٹھہر گیا۔ چوہے نے اس کے کھینچنے میں بڑا زور لگایا لیکن اونٹ نے اس کی ایک نہ مانی چوہے نے اس سے پوچھا۔ اے اونٹ اس کا کیا سبب ہے کہ اس وقت تک تو جس طرح میں تجھ سے کہتا تھا تو میری بات مانتا تھا مگر اب نافرمان ہو گیا ہے۔ اس نے کہا کہ جب تک میری مرضی تھی میں تمہارے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ اب نہیں ہے اس لئے نہیں چلوں گا۔ غرض جس وقت چوہا اونٹ کو لے جارہا تھا اس وقت گو دیکھنے میں یہ نظر آرہا ہو کہ چوہے کے پیچھے اونٹ چل رہا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ چوہا جدھر جارہا تھا ادھر ہی اونٹ بھی اپنی مرضی سے جارہا تھا۔ اسی طرح گو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان پر شیطان کا قبضہ ہے مگر اصل میں اس کا قبضہ نہیں ہوتا بلکہ انسان اپنی باگ اس کے ہاتھ میں دے کر خود اپنی مرضی سے اس کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ چنانچہ بعض انسان جب اس سے اپنی جان چھڑوانا چاہتے ہیں تو سختی سے اس کی اتباع سے انکار کر دیتے ہیں اور وہ ڈر کر ان کے پاس سے بھاگ جاتا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ قرآن میں آتا ہے۔

وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ۔ (التکویر : ۳۰) یعنی تم نہیں چاہتے مگر وہی جو خدا چاہتا ہے۔

اس سے معلوم ہؤا کہ انسان کے اعمال اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت ہیں۔

اس آیت کے یہ معنی نہیں ہیں جو سائل صاحب کے ذہن میں آئے ہیں اس آیت کا ماسبق یہ ہے۔

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ○ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ لِمَنْ شَاۗءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ○ وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (التکویر: ۲۷ تا ۳۰)

خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ تم کہاں جاتے ہو۔ یہ قرآن کریم نہیں مگر خدا تعالیٰ کی طرف سے

وعظ اور نصیحت ہے مگر اسی شخص کے لئے جو چاہے اپنے معاملات کو درست کرے اور حق پر قائم ہو۔ آگے فرماتا ہے۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ یعنی یہ تمہاری کوشش استقامت کی بھی تبھی انعام کا وارث ٹھہر سکتی ہے جب کہ تمہاری مرضی خدا تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہو جائے یعنی تمارے اعمال شریعت کے مطابق ہوں اور تمہارے عقائد بھی شریعت کے مطابق ہوں۔ جن باتوں پر خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے ایمان لاؤ اور حسن اعمال یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کا حکم دیا ہے ان کو بجالاؤ۔ جب اس طرح کرو گے اس وقت تم اس کلام کے نیک اثرات کو محسوس کرو گے ورنہ نہیں۔اور یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کسی کو کہا جائے کہ ہم تم سے تب خوش ہوں گے جب تم ہماری منشاء کے ماتحت کام کرو۔ پس اس آیت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ تمام انسانی اعمال اللہ تعالیٰ کراتا ہے اور انسان کا اس سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔

باقی رہی یہ آیت کہ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ (الرعد:۲۸)

اس کے متعلق اس وقت پوچھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ہماری جماعت میں اس کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خود کھول کر بیان کر دیا ہے کہ خدا اس کو گمراہ کرتا ہے جو خود ایسا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ ○ (المؤمن:۳۵)

یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے اسے جو مسرف اور شک کرنے والا ہوتا ہے۔

اسی طرح فرماتا ہے۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ○ (البقرۃ:۲۷)

اور نہیں گمراہ کرتا اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مگر فاسقوں کو اور اسی طرح فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ (التوبۃ:۱۱۵)

یعنی یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی ہدایت بھیجے اور پھر خود ہی بعض آدمیوں کو گمراہ کر دے۔

پس اللہ تعالیٰ اسی کو گمراہ کرتا ہے جو خود گمراہ ہوتا ہے۔ اور یہ صحیح بات ہے کہ جو آنکھیں بند رکھے وہ ایک نہ ایک دن اندھا ہو جائے گا۔ اسی طرح جو روحانی آنکھوں سے کام نہ لے وہ بھی روحانیت سے بے بہرہ ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ قانون خدا تعالیٰ نے مقرر کیا ہوا ہے اس

لئے اس کا نتیجہ خدا کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

باقی جَفَّ الْقَلَمُ اور اسی قسم کی اور حدیثیں ان کے متعلق اول تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان کو قرآن کریم کے ماتحت لانا پڑے گا اور ایسے ہی معنی کئے جائیں گے جو قرآن کریم کی آیات کے مطابق ہوں اور وہ معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ یا تو اس سے تقدیر عام مراد ہے یعنی قانون قدرت اور اس میں کیا شک ہے کہ قانون قدرت ابتدائے آفرینش سے مقرر چلا آیا ہے یا اس سے مراد ہر ایک عمل نہیں بلکہ خاص تقدیر مراد ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ خاص تقدیریں اللہ تعالیٰ ہی جاری کرتا ہے یا پھر اس سے علم الٰہی مراد ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو لوح محفوظ پر لکھی ہوئی ہیں۔

اب میں ایک خاص شبہ بیان کرتا ہوں۔ جو تقدیر کے متعلق تعلیم یافتہ طبقہ میں پھیلا ہؤا ہے۔ آج کل جہاں لوگوں میں تحقیقات کا مادہ بڑھ گیا ہے وہاں وہ ہر ایک کام کے متعلق معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کیوں ہؤا۔ مثلاً دانہ اُگتا ہے۔ اس کے متعلق تحقیق کی گئی ہے کہ کیوں اُگتا ہے۔ پہلے تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ جب دانہ زمین میں ڈالا جاتا ہے تو فرشتہ کھینچ کر اس سے بال نکال دیتا ہے۔ لیکن اب اس قسم کی باتیں کوئی ماننے کے لئے تیار نہیں ہے اور وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کیوں اُگتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ اسی طرح یہ تحقیقات کی جاتی ہیں کہ فلاں چیز کہاں سے آئی۔ مثلاً کہتے ہیں۔ پہلے دھوپ ہوتی ہے پھر اچانک بادل آجاتا ہے۔ یہ کہاں سے آتا ہے؟ علوم جدیدہ کے ماننے والے کہتے ہیں۔ بادل کئی دن سے بن رہا تھا اور کہیں دور دراز سے چلا ہؤا تھا جو اس وقت ہمارے سروں پر آگیا۔ یا ہمارے اوپر کی ٹھنڈک اور خنکی سے ان ابخرات سے جو دور سے چلے آرہے تھے یہاں آکر بادل بن گیا۔ ان لوگوں کے سامنے اگر بیان کیا جائے کہ بارش کے لئے دعا کی گئی تھی اور بادل آگیا تو وہ اس پر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ دعا تو اس وقت کی گئی تھی اور بادل اس سے کئی دن پہلے بن کر چلا ہؤا تھا۔ پھر اس کا آنا دعا کے اثر سے کس طرح ہؤا؟ اس قسم کے اعتراضات آج کل کئے جاتے ہیں مگر یہ سب باطل ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ بادل کے آنے کا سبب موجود ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو دس لاکھ یا دس کروڑ سال یا جو وقت بھی مقرر کیا جائے اس سے پہلے معلوم تھا یا نہیں کہ فلاں وقت اور فلاں موقع پر میرا فلاں بندہ دعا کرے گا۔ پھر اسے یہ خبر بھی تھی یا نہیں کہ اس وقت مجھے اس کی مدد کرنی ہے۔ اگر خبر تھی تو خواہ جس قدر عرصہ پہلے بادل تیار ہؤا اسی لئے تیار ہؤا کہ اس وقت

اس کے ایک بندہ نے دعا کرنی تھی اور خدا تعالیٰ کے رحم نے اس وقت اس بادل کو وہاں پہنچانا تھا۔ تو اس قسم کے سب اعتراض باطل ہیں کیونکہ کسی بات کا سبب پہلے ہونے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کا بلاواسطہ محرّک وہ امر نہ تھا جو پیچھے ہؤا یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ اس کے لئے نہیں ہؤا۔ کیا ایک مہمان کے آنے سے پہلے وہ چیزیں مہیا نہیں کی جاتیں جو دور سے منگوانی پڑتی ہیں۔ پھر کیا ان چیزوں کا اس مہمان کی آمد سے پہلے منگوانا اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ اس کی خاطر نہیں منگوائی گئیں۔ خدا تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ اسے معلوم تھا کہ فلاں وقت میرا بندہ بادل کے لئے دعا کرے گا اس لئے اس نے شروع پیدائش سے ایسے حکم دے چھوڑے تھے کہ اس وقت ایسے سامان پیدا ہو جاویں کہ اس بندہ کی خواہش پوری ہو جائے۔ پس اس بارش کا ہونا ایک تقدیر خاص کا نتیجہ تھا جو تقدیر عام کے پردہ میں ظاہر ہوئی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس طرح معلوم ہؤا کہ اس کی محرّک تقدیر تھی۔ اور اس کی وجہ عام اسباب قدرت نہ تھے۔ اس بات کے معلوم کرنے کے لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ کیا ایسے متواتر واقعات ہوتے ہیں جن کی نظیر دنیا کے عام قاعدہ میں نظر نہیں آتی اور اس کی وجہ سے انہیں اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ اگر یہ ثابت ہو جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کے متعلق خاص تقدیر جاری ہوئی تھی۔ مثلاً اگر دیکھیں کہ متواتر ایسا ہؤا کہ دعائیں کی گئیں اور بادل آ گئے تو اس کو اتفاق نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس کی کوئی وجہ قرار دینی پڑے گی۔ پھر اتفاق اس کو اس لئے بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس قسم کی مثالوں میں ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ صدیوں کے بعد صدیوں میں مختلف بزرگوں کی دعاؤں کے جواب میں ایسا معاملہ ہوتا آیا ہے۔ پس اسے اتفاق نہیں کہہ سکتے۔ پھر وہ جو ایسی باتوں کو اتفاق کہتے ہیں وہ خود لکھتے ہیں کہ اتفاق کوئی چیز نہیں ہے۔ ہر ایک چیز کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کے بیان کرنے کا یہ وقت نہیں ورنہ میں بتاتا کہ وہ اتفاق کے متعلق کیا سمجھتے ہیں۔ بہرحال جب وہ دنیا کے کسی معاملہ کے متعلق اتفاق کے قائل نہیں تو پھر اپنے عقیدہ کے خلاف جو بات ہو اسے اتفاق کیوں کہتے ہیں۔

غرض یہ بات خوب یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے تقدیر جاری ہے گو سبب موجود ہوتے ہیں مگر ان کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تقدیر نہیں ہے۔

## مسئلہ تقدیر کے غلط سمجھنے کے نقصان

اب میں نہایت افسوس سے ان نقصانات کا اظہار کرتا ہوں جو لوگ اس مسئلہ کو نہ سمجھنے کی

وجہ سے اٹھا رہے ہیں۔ تقدیر دراصل ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی چیز تھی کہ انسانوں کو زندہ کرنیوالی تھی۔ مگر افسوس اس کی قدر نہیں جانی گئی اور اس سے وہی سلوک کیا گیا جو قرآن کریم سے کیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے قیامت کے دن رسول کریم ﷺ خدا تعالیٰ کے حضور کہیں گے۔

یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا ۝ (الفرقان:۳۱)

کہ خدایا اس قرآن کو میری قوم نے پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا۔ اس کے مصداق رسول کریم ﷺ کے زمانہ کے وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے آپ کو نہ مانا۔ مگر مسلمان بھی ہیں اور اصل قوم رسول کریم ﷺ کی یہی ہیں۔ وہ قرآن جو ان کی ہدایت کے لئے آیا اور جس کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچانے کے لئے آیا ہے اس کو آج کل کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ زندگی بھر تو قرآن کا ایک لفظ ان کے کانوں میں نہیں پڑتا۔ لیکن جب کوئی مرجائے تو اس کو قرآن سنایا جاتا ہے۔ حالانکہ مرنے پر سوال تو یہ ہوتا ہے کہ بتاؤ تم نے اس پر عمل کیونکر کیا؟ نہ یہ کہ مرنے کے بعد تمہاری قبر پر کتنی دفعہ قرآن ختم کیا گیا ہے۔ پھر ایک استعمال اس کا یہ ہے کہ ضرورت پڑے تو آٹھ آنے لے کر اس کی جھوٹی قسم کھالی جاتی ہے اور اس طرح اسے دوسروں کے حقوق دبانے کا آلہ بنایا جاتا ہے۔ تیسرے اس طرح کہ ملّانے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کے وارث قرآن لاتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے اس کے گناہ بخشوائیں اور ملّانے ایک حلقہ سا بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور قرآن ایک دوسرے کو پکڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے یہ تیری مِلک کی۔ وہ اس طرح سمجھتے ہیں کہ مردہ کے گناہوں کا اسقاط ہوگیا۔ مگر مردہ کے گناہوں کا کیا اسقاط ہونا تھا ان ملّانوں اور اس مردہ کے وارثوں کے ایمانوں کا اسقاط ہوجاتا ہے۔ ایک اس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں کہ ملّانے آٹھ آٹھ آنہ کے قرآن لے آتے ہیں۔ جب کسی کے ہاں کوئی مرجاتا ہے اور وہ قرآن لینے آتا ہے تو اسے بہت سی قیمت بتا دی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تو ایک روپے سے بھی کم قیمت کا ہے۔ ملّاں صاحب کہتے ہیں کہ کیا قرآن سستے داموں بک سکتا ہے؟ تھوڑی قیمت پر تو اس کا بیچنا منع ہے۔ خود قرآن میں آتا ہے وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (البقرۃ:۴۲) کہ تھوڑی قیمت پر قرآن نہ خریدو اس لئے کہ اس کی تھوڑی قیمت نہیں لی جاسکتی۔ مگر وہ نادان نہیں جانتے کہ قرآن نے تو یہ بھی فرمایا ہے کہ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ (النساء:۷۸) کہ دنیا کا سب مال و متاع قلیل ہے۔ اور ثَمَنًا قَلِیْلًا کے یہ معنی ہیں کہ دنیا کے بدلے اسے نہ بیچو۔

پھر ایک استعمال اس کا یہ ہے کہ عمدہ غلاف میں لپیٹ کر دیوار سے لٹکا دیتے ہیں۔ پھر ایک یہ کہ جُزدان میں ڈال کر گلے میں لٹکا لیتے ہیں تاکہ عوام سمجھیں کہ بڑے بزرگ اور پارسا ہیں ہر وقت قرآن پاس رکھتے ہیں۔ پس جس طرح قرآن کریم کو مسلمان برے طور پر استعمال کر رہے ہیں اور اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے اسی طرح تقدیر کے مسئلہ کے متعلق کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک استعمال تو اس کا یہ ہوتا ہے کہ اپنی ندامت اور شرمندگی کے مٹانے کے لئے تقدیر کو آڑ بنا لیتے ہیں۔ مثلاً کسی کام کے لئے گئے اور وہ نہ ہؤا تو اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے کہ لوگ کہیں گے تم تو بڑا دعویٰ کرتے تھے مگر فلاں کام نہ کر سکے۔ کہتے ہیں کہ قسمت ہی اسی طرح تھی ہم کیا کرتے؟ جہاں جہاں انہیں کوئی ذلت اور رسوائی پہنچتی ہے اسے قسمت اور تقدیر کے سر منڈھ دیتے ہیں۔ حالانکہ تقدیر ندامت میں غرق کرنے کے لئے نہیں بلکہ ترقیات کے عطا کرنے کے لئے جاری کی گئی ہے۔ آگے جو شخص نقصان اٹھاتا ہے وہ تقدیر سے فائدہ نہ اٹھانے کے باعث ہوتا ہے۔

پھر اظہار مایوسی کے وقت بھی قسمت کو یاد کر لیتے ہیں۔ مثلاً کام کرتے کرتے جب ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اور یہ انسان کے لئے بدترین حالت ہے۔ کیونکہ مایوسی کا اظہار کرنا نہایت درجہ بزدلی اور دنائت پر دلالت کرتا ہے اور شریف انسان اس سے بچتا ہے۔ تو اس وقت اپنی مایوسی اور ناامیدی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ یہ بات معلوم ہوتا ہے قسمت ہی میں نہیں ہے۔ یعنی ہم تو آسمان میں سوراخ کر آویں لیکن اللہ تعالیٰ نے راستہ روک دیا ہے اور چونکہ اس کا منشاء نہیں اس لئے ہم کوشش چھوڑ دیتے ہیں اس طرح اپنی کم ہمتی اور دنائت کو خدا تعالیٰ کی تقدیر کی آڑ میں چھپاتے ہیں۔ اور شرم نہیں کرتے کہ تقدیر کو کس رنگ میں استعمال کر رہے ہیں اور اتنا نہیں سوچتے کہ ان کو کیونکر معلوم ہؤا کہ خدا تعالیٰ کی تقدیر یوں ہی تھی۔ یہ اس کے ایسے مقرب کب ہوئے کہ وہ ان پر اپنی تقدیروں کا اظہار کرنے لگ گیا۔

پھر اپنی سستی کو چھپانے کے لئے اس مسئلہ کا استعمال کرتے ہیں۔ اس لومڑی نے تو پھر بھی اچھا کیا تھا جس نے گزرتے ہوئے دیکھا کہ انگور کی بیل کو انگور لگے ہوئے ہیں۔ وہ ان کو کھانے کے لئے اچھلی کُودی مگر وہ اتنے اونچے تھے کہ پہنچ نہ سکی اور یہ کہہ کر چل دی کہ تھُو۔ کھٹے ہیں۔ گویا وہ ان کو اس لئے نہیں چھوڑ رہی کہ ان کو پا نہیں سکتی بلکہ ان کے کھٹے ہونے کی وجہ سے چھوڑ رہی ہے مگر یہ اس سے بھی بدتر نمونہ دکھاتے ہیں۔ یہ بغیر کسی کام کے لئے کوشش

کرنے کے یہ کہہ کر اپنی سستی پر پردہ ڈال دیتے ہیں کہ اگر قسمت ہوئی تو مل کر رہے گا اور نادان نہیں سوچتے کہ تم کب اس قابل ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے قانون کو بدل کر ایک خاص تقدیر جاری کرے گا اور تمہارے لئے رزق مہیا کرے گا۔ اور پھر بات تو تب تھی کہ سب کام چھوڑ دیتے۔ لیکن ایسا نہیں کرتے جس کام کے بغیر چارہ نہ ہو اسے کرنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں۔ یا جو کام زیادہ قربانی اور محنت نہ چاہتا ہو اس کے کرنے میں عذر نہیں کرتے۔ اگر قسمت پر ایسا ایمان تھا تو پھر چھوٹے چھوٹے کام کیوں کرتے ہو؟ درحقیقت ان لوگوں کا فعل اس لومڑی کے فعل سے بھی بدتر ہے نہ صرف اس لئے کہ اس نے کوشش کے بعد چھوڑا اور یہ بغیر کوشش کے چھوڑ دیتے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ اس نے تو اپنے ترکِ عمل کو انگوروں کے کھٹے ہونے کی طرف منسوب کیا اور یہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ لوگ خود ست ہوتے ہیں کام کرنے کو جی نہیں چاہتا محنت سے دل گھبراتا ہے اور اسے موت سے بدتر خیال کرتے ہیں لیکن جب ترقیات کے راستوں پر قدم زن ہونے کے لئے انہیں کہا جاتا ہے تو کہہ دیتے ہیں اگر فلاں چیز نے ملنا ہو گا تو آپ ہی مل رہے گی ہمارے محنت کرنے سے کیا ملتا ہے اور اس طرح اپنی کمزوری تقدیر کی چادر میں چھپاتے ہیں۔

پھر گالی کے طور پر تقدیر کو استعمال کرتے ہیں۔ یعنی جس کو گالی دینی ہو اسے کہتے ہیں چل بدقسمت۔ گویا جس طرح اور برے الفاظ ہیں اسی طرح قسمت کا لفظ ہے۔ اور ان کے نزدیک خدا کی اس نعمت کا استعمال یہ ہے کہ اپنی زبانوں کو گندہ کریں۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے تقدیر اس لئے جاری کی تھی کہ انسان اس کے ذریعہ اپنے آپ کو پاک کریں۔

پھر اس کا ایک استعمال خدا کو گالیاں دینے کے لئے ہوتا ہے۔ خدا نے تو تقدیر اس لئے بنائی ہے کہ خدا سے انسان کا تعلق مضبوط ہو مگر وہ اس کا الٹا استعمال کرتے ہیں۔ اگر بعض لوگوں کے گھروں میں کوئی موت ہو جائے۔ مثلاً کوئی بچہ مرجاوے تو وہ کہتا ہے کہ "ربّا تیرا پُتّر مردا تے تینوں پتہ لگدا" یعنی اے خدا تیرا لڑکا مرتا تو تجھے معلوم ہوتا کہ اس کا کس قدر صدمہ ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک گویا خدا نے ان پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ خدا پر بھی ایسا ہی ظلم ہو۔ یہاں ایک شخص تھے بعد میں وہ بہت مخلص احمدی ہو گئے اور حضرت صاحبؑ سے ان کا بڑا تعلق تھا۔ مگر احمدی ہونے سے قبل حضرت صاحبؑ ان سے بیس سال تک ناراض رہے۔ وجہ یہ کہ حضرت صاحبؑ کو ان کی ایک بات سے سخت انقباض ہو گیا۔ اور وہ اس طرح کہ ان

کا ایک لڑکا مر گیا۔ حضرت صاحبؑ اپنے بھائی کے ساتھ ان کے ہاں ماتم پرسی کے لئے گئے۔ ان میں قاعدہ تھا کہ جب کوئی شخص آتا اور اس سے ان کے بہت دوستانہ تعلقات ہوتے تو اس سے بغل گیر ہو کر روتے اور چیخیں مارتے۔ اسی کے مطابق انہوں نے حضرت صاحبؑ کے بڑے بھائی سے بغل گیر ہو کر روتے ہوئے کہا کہ خدا نے مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔ یہ سن کر حضرت صاحبؑ کو ایسی نفرت ہوگئی کہ ان کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ بعد میں خدا نے انہیں توفیق دی اور وہ ان جہالتوں سے نکل آئے۔ غرض تقدیر کے مسئلہ کے غلط سمجھنے کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے ہم پر یہ ظلم کیا وہ ستم کیا اور اس طرح خدا کو گندی گالیاں دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے ان افعال کا الزام ان پر ہے جنہوں نے ان کے دلوں میں یہ خیال ڈال دیا ہے کہ سب کچھ خدا کرتا ہے۔ اس خیال کو رکھ کر جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں خدا نے ہم پر یہ ظلم کیا ہے۔

## ایمان بالقدر کی ضرورت

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ ایمان بالقدر کی ضرورت کیا ہے؟ میں نے بتایا ہے قدر نام ہے صفات الٰہیہ کے ظہور کا۔ اور جب تک کوئی انسان اس پر ایمان نہیں لاتا اس کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ پس تقدیر ایمان کی تقویت اور تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اگر یہ مسئلہ نہ ہوتا تو پہلا نقص یہ ہوتا کہ ایمان نامکمل رہ جاتا۔

## اگر تقدیر الٰہی جاری نہ ہوتی تو کیا نقصان ہوتا

اگر تقدیر نہ ہوتی تو پہلا نقصان یہ ہوتا کہ انسان نہ دین میں سُکھ پا سکتا نہ دنیا میں۔ میں نے بتایا ہے کہ ایک تقدیر یہ ہے کہ آگ جلائے۔ پانی پیاس بجھائے یعنی وہ احکام جن کے ذریعہ سے خواص الاشیاء مقرر کئے گئے ہیں۔ اسی قاعدہ سے فائدہ اٹھا کر دنیا اپنا کاروبار کر رہی ہے۔ ایک زمیندار گھر سے دانہ لے جاکر زمین میں ڈالتا ہے۔ گویا بظاہر اس کو ضائع کرتا ہے۔ مگر کیوں؟ اس لئے کہ اسے امید ہے کہ اُگ کر ایک دانہ کے کئی کئی دانے بن جائیں گے۔ لیکن اسے یہ امید اور یہ یقین کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس کا باپ' اس کا دادا' اس کا پڑدادا جب جب اس طرح کرتا رہا ہے ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ اور خدا نے یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ جب دانہ زمین میں ڈالا جائے تو اس کے اُگنے سے کئی دانے پیدا ہو جائیں۔ لیکن اگر یہ قاعدہ مقرر نہ ہوتا بلکہ اس طرح ہوتا کہ زمیندار کو کنک (گندم) کی ضرورت ہوتی اور وہ کنک بوتا تو کبھی کنک اگ آتی کبھی کیکر اُگ آتا کبھی انگور کی بیل نکل آتی وغیرہ۔ تو کچھ مدت کے بعد

زمیندار اس بونے کے فعل کو لغو سمجھ کر بالکل چھوڑ دیتا اور اپنی محنت کو ضائع خیال کرتا۔ اسی طرح اب تو سنار کو یقین ہے کہ سونا جب آگ میں ڈالوں گا تو پگھل جائے گا اور پھر جس طرح اس سے چاہوں گا زیور بنالوں گا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا بلکہ یہ ہوتا کہ سنار کو کوئی کڑے بنانے کے لئے سونا دیتا اور وہ جب اسے پگھلاتا تو وہ چاندی نکل آتی یا کوئی چاندی دیتا تو وہ پیتل نکل آتی۔ کیونکہ کوئی قاعدہ مقرر نہ ہوتا تو کیا حالت ہوتی یہی کہ بیچارے سنار کو مار مار کر اس کی ایسی گت بنائی جاتی کہ وہ اس کام کے کرنے سے توبہ کرلیتا۔ اسی طرح لوہار جب لوہے کو گرم کرکے اس پر ہتھوڑا مارتا کہ اسے لمبا کرے۔ لیکن وہ کبھی خَود بنتا جاتا، کبھی ہارن کی شکل اختیار کرلیتا، یا وہ کدال بناتا تو آگے تلوار بن جاتی اور اسے پولیس پکڑلیتی کہ ہتھیار بنانے کی اجازت تم کو کس نے دی ہے۔ یا اسی طرح ڈاکٹر تپ کے اترنے کی دوائی دیتا لیکن اس سے کھانسی بھی ہوجاتی تو ڈاکٹروں کی کون سنتا۔ اب تو اگر کسی کو کھانسی ہو تو ایک زمیندار بھی کہتا ہے کہ اسے بنفشہ پلاؤ۔ کیونکہ تجربے نے بتا دیا ہے کہ اس سے کھانسی کو فائدہ ہوتا ہے لیکن اگر یہ قانون مقرر نہ ہوتا بلکہ یہ ہوتا کہ کبھی بنفشہ پلانے سے کھانسی ہوجاتی اور کبھی بخار بڑھ جاتا۔ کبھی قبض ہوجاتی اور کبھی دست آجاتے۔ کبھی بھوک بند ہوجاتی اور کبھی زیادہ ہوجاتی تو کون بنفشہ پلاتا۔ بنفشہ تب ہی پلایا جاتا ہے کہ خدا نے مقرر کردیا ہؤا ہے کہ اس سے خاص قسم کی کھانسی کو فائدہ ہو۔ اسی طرح زمیندار تب ہی غلہ گھر سے نکال کر زمین میں ڈالتا ہے کہ اسے یقین ہے کہ گیہوں سے گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ اگر اسے یقین نہ ہوتا تو کبھی نہ نکالتا وہ کہتا نہ معلوم کیا پیدا ہوجائے گا میں کیوں اس غلہ کو بھی ضائع کروں لیکن اب وہ اس لئے مٹی کے نیچے گندم کے دانوں کو دباتا ہے کہ خدا نے تقدیر مقرر کی ہوئی ہے کہ گندم سے گندم پیدا ہو۔ اسی طرح روٹی کھانے سے پیٹ بھرتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا کہ کبھی ایک لقمہ سے پیٹ بھر جاتا اور کبھی کوئی سارا دن روٹی کھاتا رہتا اور پیٹ نہ بھرتا تو پھر کس کو ضرورت تھی کہ کھانا کھاتا اور کیوں پیسے ضائع کرتا یا گھر میں آگ جلانے سے کھانا پکایا جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ ہوتا کہ کبھی سارا دن پُھلکہ توے پر پڑا رہتا اور آگ جلتی رہتی لیکن وہ گیلے کا گیلا ہی رہتا اور کبھی آٹا ڈالتے ہی جل جاتا اور کبھی سینک لگنے سے پھلکا پکنے لگتا اور کبھی موٹا ہو کر ڈبل روٹی بن جاتا تو کون پھلکے پکانے کی جرأت کرتا۔ اسی طرح کبھی ساگ کچا رہتا اور کبھی پک جاتا تو کون پکاتا۔ یا اب معلوم ہے کہ مصری ڈالنے سے چیز میٹھی ہوجاتی ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا کہ کبھی مصری ڈالنے سے میٹھی ہوجاتی، کبھی کڑوی، کبھی

نمکین اور کبھی کھٹی، کبھی کسیلی اور کبھی کسی اور مزے کی تو کیا کوئی مصری یا کھانڈ کو استعمال کر سکتا۔ یہ جس قدر کارخانہ عالم چل رہا ہے اس کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ مسئلہ تقدیر ہے۔ خدا تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے کہ میٹھا میٹھے کا مزا دے۔ کھٹا کھٹے کا مزا دے۔ آگ سے کھانا پکے۔ روٹی سے پیٹ بھرے وغیرہ وغیرہ۔ اور لوگوں نے اس کا تجربہ کر لیا ہے۔ پس وہ ان باتوں کے لئے روپیہ صرف کرتے ہیں۔ محنت برداشت کرتے ہیں۔ پس معلوم ہؤا کہ دنیا کا جتنا کاروبار اور جتنی ترقیاں ہیں وہ سب تقدیر کے مقرر ہونے کی وجہ سے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتی تو دنیا ہی نہ ہوتی۔ اور اس کا کارخانہ نہ چل سکتا پس انسان کی زندگی تقدیر کے ساتھ قائم ہے کیونکہ انسان کھانے پینے اور دوسری ضروریات کے پورا ہونے سے زندہ رہ سکتا ہے اور ان ضروریات کے پورا کرنے کے لئے وہ تبھی محنت کرتا ہے جب وہ جانتا ہے کہ میری کوشش کا کوئی مفید نتیجہ نکلے گا۔ اگر کوئی قاعدہ مقرر نہ ہوتا تو وہ محنت بھی نہ کرتا اور زندہ بھی نہ رہتا۔

یہ تو عام تقدیر کے نہ ہونے کا نقصان تھا۔ اب تقدیر خاص کے نہ ہونے کے متعلق بتاتا ہوں۔

## تقدیر خاص کے نہ ہونے کے نقصان

جس طرح تقدیر عام سے دنیا کا قیام اور اس کی ترقی وابستہ ہے۔ اسی طرح روحانیت کا قیام اور اس کی ترقی تقدیر خاص سے وابستہ ہے۔ اور جس طرح اگر تقدیر عام نہ ہوتی تو دنیا باطل ہوتی اسی طرح اگر تقدیر خاص نہ ہوتی تو روحانیت باطل ہو جاتی۔

اس کا پہلا نقصان تو یہ ہے کہ اس کے بغیر انسان خدا پر ایمان نہیں لا سکتا۔ اس لئے کہ خدا پر ایمان لانے کی بڑی سے بڑی دلیل یہ دنیا کا کارخانہ ہے کہ اتنے بڑے کارخانہ کا بنانے والا کوئی ہونا چاہئے۔ چنانچہ کسی فلسفی نے ایک اعرابی سے پوچھا تھا کہ تمہارے پاس خدا کے ہونے کی کیا دلیل ہے۔ اس نے کہا کہ جب میں مینگنی دیکھتا ہوں تو سمجھ لیتا ہوں کہ ادھر سے کوئی بکری گزری ہے۔ یا اونٹ کا پاخانہ دیکھتا ہوں تو معلوم کر لیتا ہوں کہ یہاں سے کوئی اونٹ گزرا ہے یا پاؤں کے نشان دیکھ کر معلوم کر لیتا ہوں کہ ادھر سے کوئی انسان گزرا ہے تو کیا اتنے بڑے کارخانہ کو دیکھ کر میں نہیں سمجھ سکتا کہ خدا ہے؟ مگر یہ دلیل مکمل نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے یہی ثابت ہے کہ خدا ہونا چاہئے نہ یہ کہ ہے۔ حضرت صاحبؑ نے اس کے متعلق براہین احمدیہ میں خوب کھول کر لکھا ہے۔

اب سوال ہو سکتا ہے کہ پھر کس طرح معلوم ہو کہ خدا ہے؟ یہ بات اسی طرح معلوم

ہو سکتی ہے کہ خدا تعالیٰ اپنی قدرت کا کوئی نمونہ دکھائے جس کو دیکھ کر یقین کیا جاسکے کہ خدا تعالیٰ واقع میں موجود ہے۔ جب لوگ دیکھ لیں کہ ایک کام انسان کی طاقت سے بالا تھا اور وہ ایک شخص کے قبل از وقت خبر دینے کے بعد خارق عادت طور پر ہو گیا تو وہ سمجھ سکتے ہیں کہ خدا ہی ہے جس نے یہ کام کر دیا ہے۔

اس موقع پر میں ایک بات بتانی چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت صاحبؑ نے تو یہ لکھا ہے کہ الہام سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ہے۔ مگر تم کہتے ہو کہ تقدیر سے۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ اصل میں دونوں باتیں صحیح ہیں اور وہ اس طرح کہ یہ بات کہ خدا ہے اسی الہام سے ثابت ہوتی ہے جس میں تقدیر کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ ورنہ اگر خدا کی طرف سے خالی یہ الہام ہو کہ میں ہوں تو لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ الہام ملہم کا وہم ہے اس سے خدا کی ہستی ثابت نہیں ہوتی۔ بہت دفعہ الہام بطور وہم کے بھی ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک دفعہ ایک شخص آیا وہ کہتا تھا کہ مجھے آوازیں آتی ہیں۔ "تم مہدی ہو" مہمان خانہ میں ٹھہرا ہؤا تھا اور وہیں مولوی غلام رسول صاحب راجیکی ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کو بلا کر سمجھایا کہ کیا اگر کوئی مولوی صاحب ! مولوی صاحب ! کرکے آواز دے تو سمجھ لو گے کہ تمہیں بلاتا ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ انہوں نے پوچھا کیا اگر کوئی حکیم صاحب یا ڈاکٹر صاحب کہہ کر آواز دے تو تم کیا سمجھو گے؟ اس نے کہا یہی سمجھوں گا کہ کسی حکیم صاحب یا ڈاکٹر صاحب کو بلایا جارہا ہے۔ اور میں نے بھی یہ آواز سن لی ہے۔ مولوی صاحب نے کہا۔ جب ڈاکٹر صاحب اور حکیم صاحب کی آواز سن کر تم یہ نہیں سمجھتے کہ کوئی تمہیں مخاطب کر رہا ہے تو پھر جب مہدی اور مسیح کی آواز تم کو آتی ہے تو اپنے آپ کو مہدی اور مسیح کیونکر سمجھ لیتے ہو؟

اسی طرح حضرت صاحبؑ کے زمانہ میں ایک شخص آیا اور آکر کہنے لگا۔ مجھے کبھی محمدؐ کہا جاتا ہے، کبھی عیسیٰؑ، کبھی موسیٰؑ، کبھی ابراہیمؑ اور میں کبھی عرش پر چلا جاتا ہوں۔ حضرت صاحبؑ نے کہا۔ جب تمہیں موسیٰؑ کہا جاتا ہے تو حضرت موسیٰؑ جیسا معجزہ بھی دیا جاتا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا جب عیسیٰؑ کہا جاتا ہے تو تمہیں عیسیٰؑ والے نشان دیئے جاتے ہیں؟ کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ جب محمدؐ کہا جاتا ہے تو محمدؐ کی طاقتیں بھی دی جاتی ہیں؟ کہا نہیں آپ نے فرمایا۔ جب تم عرش پر جاتے ہو تو کیا جلالی نشانات بھی دیئے جاتے ہیں؟ کہا نہیں۔ آپ نے

فرمایا جو شخص کسی کو کہتا ہے کہ لے۔ اور جب وہ لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے تو کچھ نہیں دیتا۔ کیا اس کے اس فعل سے معلوم نہیں ہوتا کہ اس سے ہنسی کی جارہی ہے یا اس کی آزمائش ہو رہی ہے۔ اسی طرح تم سے یہ استہزاء کیا جارہا ہے جو تمہارے گناہوں کی وجہ سے ہے۔ تم بہت توبہ کرو۔

غرض الہام چونکہ وہم اور وسوسہ اور مرض اور شیطانی القاء کا بھی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے خالی الہام پر شبہ کیا جاسکتا ہے کہ شیطانی نہ ہو یا مرض نہ ہو لیکن جب اس کے ساتھ قدرت ہوتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی زبردست ہستی کی طرف سے ہے۔ پس یہ دونوں باتیں درست ہیں کہ الہام ہی خدا تعالیٰ کے متعلق یقین کے مرتبہ پر پہنچاتا ہے اور اظہار تقدیر ہی "خدا ہے" کے مرتبہ تک پہنچاتا ہے۔ اور اگر تقدیر نہ ہوتی تو خدا تعالیٰ پر ایمان بھی نہ ہوتا۔ دنیا کو دیکھ کر کہا جاسکتا تھا کہ یونہی بن گئی ہے۔ مگر جب خدا کی طاقت اور قدرت کو انسان دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا ہے۔ چنانچہ حضرت صاحبؑ فرماتے ہیں۔

قدرت سے اپنی ذات کا دیتا ہے حق ثبوت
اس بے نشان کی چہرہ نمائی یہی تو ہے

اس میں حضرت صاحبؑ نے بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ قدرت سے اپنی چہرہ نمائی کرتا ہے اور اس وقت تک خدائی ثابت نہیں ہوتی جب تک وہ قدرت نمائی نہ کرے۔ وہ لوگ جو قدرت دیکھنے والے نہیں ہوتے وہ یوں کہہ دیتے ہیں کہ خدا کو کس نے پیدا کیا جو اس کو مانیں؟ لیکن جب اس کی قدرت دیکھ لیتے ہیں تو ان پر ثابت ہو جاتا ہے کہ خدا ہے۔

پس اگر تقدیر نہ ہو تو خدا تعالیٰ پر بھی ایمان نہیں رہتا اور اگر ایمان خدا پر کسی طرح حاصل بھی ہو جائے تو تقدیر کے بغیر محبت اور اخلاص نہیں پیدا ہو سکتا مثلاً بادشاہ کی ذات ہے۔ کسی کا دل نہیں چاہتا کہ اس کی طرف چٹھی لکھے کیونکہ اس سے ذاتی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن جن لوگوں سے ذاتی تعلق ہوتا ہے ان کی طرف خط لکھنے کا خیال بار بار پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح عام بات کا اور مزا ہوتا ہے اور اگر وہ بات اپنی ذات سے تعلق رکھتی ہو تو اور ہی مزا ہوتا ہے۔ اگر بادشاہ کا عام اعلان ہو تو اس سے کوئی خاص لطف نہیں اٹھایا جاتا۔ لیکن اگر خاص کسی کے نام بادشاہ کی چٹھی ہو تو اسے اپنے لئے بڑا فخر سمجھتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ سے محبت اور اخلاص ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس سے انسان کا ذاتی طور پر تعلق ہو اور وہ تعلق تقدیر کے ذریعہ قائم ہو سکتا

ہے۔

تیسرا نقصان اگر تقدیر نہ ہوتی تو یہ ہوتا کہ تقریباً سارے انسانوں کی نجات نہ ہو سکتی۔ اس لئے کہ اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ابتداء میں گناہ کرتے ہیں اور جب انہیں سمجھ آتی ہے تو ان کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اب اگر تقدیر نہ ہوتی اور تدبیر ہوتی تو یہی ہوتا کہ جو کچھ انسان کر چکا ہوتا اسی کے مطابق اسے بدلہ ملتا۔ کیونکہ اس کو اپنے کئے ہوئے کے مطابق ہی ملنا تھا خدا نے کچھ نہیں دینا تھا۔ اب ایک ایسا شخص جس نے اسّی سال گناہ کئے اور اکاسیویں سال نمازیں پڑھیں اور اچھے عمل کئے اسے تدبیر کا اس قدر بوجھ جہنم میں ہی لے جاتا۔ لیکن اس موقع پر تقدیر کام کرتی ہے اور یہ کہ خدا کی تقدیر ہے کہ اگر بندہ اپنے گناہوں سے توبہ کرے تو ان کو مٹا دیا جائے گا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ (ھود:۱۱۵) کہ نیکیاں بدیوں کو مٹا دیا کرتی ہیں۔

لیکن اگر یہ تقدیر نہ ہوتی تو لوگوں کی نجات مشکل ہو جاتی۔ اگر تقدیر نہ ہوتی تو توبہ کا مسئلہ بھی نہ ہوتا اور جب توبہ کا مسئلہ نہ ہوتا تو انسان کے گناہ معاف نہ ہو سکتے اور وہ نجات نہ پا سکتا۔ لیکن خدا نے یہ تقدیر رکھ دی ہے کہ اگر انسان توبہ کرے تو اس کے گناہ مٹا دیئے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر انسان غرغرہ سے پہلے کسی وقت بھی توبہ کرے گا تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی اور یہ آخری وقت کی نیکی اس کی تمام عمر کی بدیوں کو مٹا دے گی۔ (ترمذی ابواب الدعوات باب ماجاء فی فضل التوبة والاستغفار وما ذکر من رحمة اللّٰہ لعبادہ)

تو تقدیر کے مسئلہ کی وجہ سے انسان ہلاکت سے بچتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایک انسان اپنے گناہوں پر مصر تھا۔ میں نے اسے کہا کہ گناہوں کو چھوڑ دو۔ وہ کہنے لگا کہ میں نے اتنے گناہ کئے ہیں کہ سیدھا جہنم میں ہی جاؤں گا پھر گناہوں کو چھوڑنے کا کیا فائدہ؟ میں نے کہا یہ غلط ہے۔ خدا گناہوں کو معاف کر دیتا ہے اگر انسان توبہ کرے۔ آدمی سمجھدار تھا یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے گناہ چھوڑ دیئے۔ تو اگر تقدیر نہ ہوتی تو توبہ نہ ہوتی۔ اور توبہ نہ ہوتی یعنی خدا اپنے بندوں کی طرف رجوع نہ کرتا اور ان کی بدیوں کو نہ مٹاتا تو انسان ہلاک ہو جاتا۔

## تقدیر خاص کی اہمیت اور ضرورت

اب ایک اور بات بتاتا ہوں اور وہ یہ کہ تقدیر خاص کی اہمیت اور ضرورت کیا ہے؟ اس میں

شک نہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے تقدیر رکھی ہے اور بندہ کا کام ہے کہ اس کے ماتحت کام کرے۔ مگر یہ ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات عام تقدیر کام نہ آسکے۔ مثلاً ایک انسان جنگل میں ہے اور اس کو پانی کی ضرورت ہے۔ لیکن وہاں نہ کوئی کنواں ہے اور نہ چشمہ۔ اس موقع پر پانی حاصل کرنے کے لئے کیا تقدیر ہے؟ یہی کہ کنواں کھود کر پانی نکالے۔ لیکن اگر وہ جنگل میں کنواں کھودنے لگے تو قبل اس کے کہ پانی نکلے وہ ہلاک ہو جائے گا۔ ایسے وقت کے لئے خدا تعالیٰ نے خاص تقدیر رکھی ہے جس کے جاری ہونے سے انسان ہلاک ہونے سے بچ سکتا ہے۔ اگر وہ جاری نہ ہو تو اس کی ہلاکت میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ اور خاص تقدیر یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے حضور دعا کرے اور خدا اس کے لئے پانی حاصل کرنے کا کوئی خاص سامان کر دے۔ اس کی مثال کے طور پر میں ایک صحابیؓ کا ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ ان کو رومیوں کے لشکر نے پکڑ کر قید کر لیا اور وہ صحابیؓ کو پکڑ کر قید کرنے پر بہت خوش ہوئے۔ بادشاہ نے اس کو کوئی بہت سخت سزا دینی چاہی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ان کے مذہب میں سؤر کھانا منع ہے۔ وہ پکا کر اسے کھلایا جائے۔ چنانچہ سؤر کا گوشت پکا کر ان کے سامنے رکھا گیا۔ لیکن انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ انہیں بار بار کہا گیا لیکن انہوں نے نہ کھایا۔ آخر بھوک کی وجہ سے ان کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ اس موقع پر وہ اپنی جان بچانے کے لئے کوئی سامان نہیں کر سکتے تھے اور تقدیر عام ان کی مدد نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ دوسروں کے ہاتھوں میں قید تھے۔ اس موقع پر خدا ہی کچھ کرتا تو ہو سکتا تھا۔ لیکن اگر خدا نے یہ فیصلہ کیا ہوتا کہ ہر موقع پر سامان کے ذریعہ ہی کام ہو تو ان کی نجات کی صورت نہ ہو سکتی تھی۔ مگر چونکہ خدا تعالیٰ نے تقدیر خاص کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہے ان کے بچاؤ کی صورت ہو گئی۔ اور وہ اس طرح کہ جب چار پانچ دن ان کو بھوکے گزرے تو خدا نے روم کے بادشاہ کے سر میں سخت درد پیدا کر دیا۔ جس قدر دوائیاں ممکن تھیں اس نے کیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہؤا۔ کسی نے کہا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ جس شخص کو آپ نے قید کیا ہؤا ہے اس کی آہ لگی ہے اور اس وجہ سے یہ سزا مل رہی ہے۔ بادشاہ نے کہا معلوم ہوتا ہے یہی وجہ ہے اس نے صحابیؓ کو بلا کر ان سے ملاطفت کی اور حضرت عمرؓ کو اپنی سر درد کے متعلق لکھا جنہوں نے اس کو پرانی ٹوپی بھیجی کہ یہ پہن لو سر کا درد جاتا رہے گا۔ اور یہ بھی لکھا کہ ہمارا ایک بھائی تمہارے پاس قید ہے اس کو بعزت و احترام چھوڑ دو۔ اس نے ایسا ہی کیا اور ٹوپی پہننے سے اس کی درد جاتی رہی۔

پس یہ تقدیر تھی جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس صحابیؓ کو نجات دی۔ تقدیر عام کے ذریعہ اس صحابیؓ کی مشکل کا کوئی حل ممکن نہ تھا۔ پس خدا تعالیٰ نے بادشاہ کی گردن پکڑ کر اس سے صحابیؓ کو آزاد کرا دیا۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ خدا تعالیٰ کا حکم ہؤا کہ فلاں ملک میں چلے جاؤ۔ جب وہ اپنے ساتھیوں سمیت چلے تو راستہ میں ایسا جنگل آگیا جہاں پانی نہیں مل سکتا تھا اور کنواں بھی نہیں نکل سکتا تھا کیونکہ پتھریلی زمین تھی۔ اس موقع پر وہ کیا کرتے۔ نہ ادھر کے رہے تھے نہ ادھر کے۔ نہ واپس جا سکتے تھے نہ آگے بڑھ سکتے تھے۔ اگر اس وقت خدا ہی اپنا رحم نہ کرتا تو وہ کیا کر سکتے تھے؟ اس وقت ایک ہی علاج تھا کہ اللہ تعالیٰ خاص تقدیر جاری کرے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے خدا تعالیٰ سے عرض کیا کہ الٰہی ہم پیاسے مرنے لگے ہیں آپ ہی کوئی انتظام کیجئے کہ ہمیں پانی مل جائے۔ اس پر خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ فلاں جگہ جا اور جا کر اپنا عصا مار۔ چنانچہ اس جگہ جا کر جب انہوں نے عصا مارا تو چشمہ پھوٹ پڑا اور ان کو پانی مل گیا۔ اب اس جگہ چشمہ تو ازل سے موجود تھا مگر کیوں؟ اس لئے کہ یہاں ایک موسیٰؑ پہنچے گا اور اسے اور کہیں سے پانی نہیں ملے گا اس وقت یہاں سے پانی دیا جائے گا۔

تو جہاں اسباب کام نہیں دیتے اور ایسے مواقع پیش آتے ہیں۔ اس وقت اگر ہلاکت سے بچنے کا کوئی ذریعہ ہے تو تقدیر خاص ہی ہے۔ پس اگر تقدیر خاص نہ ہوتی تو یہ نقصان ہوتے کہ۔

(۱) ایمان باللہ حاصل نہ ہو سکتا۔

(۲) خدا تعالیٰ کے ساتھ بندہ کے تعلقات مضبوط نہ ہو سکتے۔

(۳) توبہ کر کے گناہوں سے بچنے کا موقع نہ ملتا۔

(۴) ایسے مواقع پر جن میں اسباب نہیں مہیا ہو سکتے ان میں انسان ہلاکت سے نہ بچ سکتا۔

## تقدیر نہ ہونے کا ایک اور نقصان

پھر یہ کہ اگر تقدیر نہ ہوتی تو ساری دنیا شرک میں مبتلاء ہو جاتی وجہ یہ کہ ایسے نبی جو شریعت لاتے ہیں اور اپنی جماعتیں قائم کرتے ہیں وہ سارے ایسی حالت میں آتے کہ ان کے پاس سامان کچھ نہ ہوتے۔ نبی کریم ﷺ نے جب مکہ میں بتوں کو باطل قرار دیا تو اس وقت آپؐ کے ساتھ کوئی سامان نہ تھے۔ اور مکہ والے جن کا گزارہ ہی بتوں پر تھا چاہتے تھے کہ آپؐ کو مار دیں۔ ان کے مقابلہ کے لئے آپ کے پاس نہ فوج تھی نہ طاقت۔ اب اگر سامانوں پر ہی کامیابی

منحصر ہوتی تو کفار کو ہوتی اور وہ رسول کریم ﷺ پر غلبہ پا کر آپ ؐ کو ہلاک کر دیتے اور آپ ؐ کے ہلاک ہو جانے کا یہ نتیجہ ہوتا کہ دنیا ظلمت اور گمراہی میں ہی پڑی رہتی۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ ؑ اور حضرت موسیٰ ؑ کے پاس کوئی سامان نہ تھے۔ اگر صرف تدبیر یا تقدیر عام ہی ہوتی تو جو نبی آتا وہ مارا جاتا اور انبیاء ؑ کا سلسلہ ہی دنیا میں نہ چلتا۔ کیونکہ انبیاء کے دشمن طاقتور ہوتے ہیں۔ ان کے پاس سامان ہوتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ تقدیر خاص کو نازل کر کے ان کی مدد کرتا ہے اور انہیں کامیابی حاصل ہوتی ہے ورنہ وہ زندہ نہ رہ سکتے اور دنیا سے شرک کو نہ مٹا سکتے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ نبی خدا بناتا ہے یا انسان؟ اگر خدا بناتا ہے تو وہ محمد (ﷺ) جیسے بے سروسامان انسان کو نہ بناتا۔ قیصر جیسے زبردست بادشاہ کو بنا دیتا؟ پس خدا بجائے کمزوروں کو نبی بنانے کے بڑے بڑے بادشاہوں کو بنا دیتا اور تقدیر جاری نہ کرتا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو خدا تعالیٰ بندوں کا محتاج ہوتا۔ بندے خدا کے محتاج نہ ہوتے کیونکہ وہ کہتے کہ خدا کو ہم نے ہی اپنی طاقت سے منوایا ہے ورنہ کون اسے مان سکتا تھا۔ گویا خدا پر ان کا احسان ہوتا۔ پس خدا تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کو نبوت کے لئے چنتا ہے جو ہر وقت اپنے اوپر خدا تعالیٰ کا احسان اور فضل ہوتا دیکھتے اور اس کے شکر گزار بنتے ہیں۔

کوئی یہ مت خیال کرے کہ حضرت داؤد ؑ اور حضرت سلیمان ؑ جو نبی تھے وہ بادشاہ تھے۔ کیونکہ یہ دونوں نبی نئی جماعتیں تیار کرنے والے نہ تھے۔ ایسے نبی امراء اور بادشاہوں میں سے ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ نبی جو نئے سرے سے دنیا کو قائم کرنے کے لئے آتے ہیں اور جن کے ذریعہ مردہ قوم زندہ کی جاتی ہے وہ صرف غرباء میں سے ہی ہوتے ہیں۔

## تقدیر پر ایمان لانے سے روحانیت کے سات درجے طے ہوتے ہیں

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ تقدیر پر ایمان لانے کے کیا فائدے ہیں۔

**درجہ اول**

پہلا فائدہ تو عام تقدیر کے ماتحت یہ ہے کہ دنیاوی ترقیات حاصل ہوتی ہیں۔ اگر تقدیر پر ایمان نہ لایا جاوے تو کوئی کام چل ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ تمام کارخانہ عالم اسی بناء پر چل رہا ہے کہ انسان قدرت کے بعض قواعد پر ایمان لے آتا ہے۔ مثلاً یہ کہ آگ جلاتی ہے ' پانی بجھاتا ہے ' اگر خواص الاشیاء پر یقین نہ ہو تو انسان سب کوششیں چھوڑ دے اور

سب کارخانہ باطل ہو جائے۔ اور روحانیت میں یہ فائدہ ہے کہ حق اس سے قائم رہتا اور ایمان حاصل ہوتا ہے اور وہ اس طرح کہ جس طرح ایک زمیندار یہ دیکھ کر کہ گیہوں بونے سے گیہوں ہی پیدا ہوتا ہے بیج ڈالتا ہے۔ اسی طرح جب لوگ شریعت کے احکام پر چلنے کے نیک نتائج دیکھتے ہیں تو ان کو بھی ان پر عمل کرنے کی جرأت اور جوش پیدا ہوتا ہے اور انہیں ایمان حاصل کرنے کی تحریک ہوتی ہے۔ ورنہ جب نبی آتے تو لوگ انہیں دھکے دے کر باہر نکال دیتے اور کہتے کہ جب ان کے ماننے کا کوئی فائدہ نہیں تو انہیں کیوں مانیں؟ محمد رسول اللہ ﷺ کو لوگوں نے کیوں مانا؟ اسی لئے کہ انہوں نے دیکھا کہ آپؐ کی تعلیم پر عمل کرکے انسان کی روحانی اور اخلاقی حالت کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی تائید اور نصرت آپؐ کے ماننے والوں کے شامل حال ہوتی ہے۔ پس ان کے دل میں بھی تحریک ہوئی کہ ہم بھی اس تقدیر سے فائدہ اٹھائیں اور خدا تعالیٰ کے فضل کو اپنے لئے اور اپنے اہل و عیال کے لئے جذب کریں۔

**درجہ دوم** پس تقدیر عام شرعی کے ماتحت دوسروں کے لئے ایک مثال قائم ہوتی ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھانے کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ تب ان کے لئے تقدیر خاص جاری ہوتی ہے اور اس کے ماتحت وہ اور بھی زیادہ ترقی کرتے ہیں اور درجہ دوم میں داخل ہو جاتے ہیں یعنی تقدیر پر ایمان ان کو مقام صبر اور رضا تک پہنچا دیتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ابتلاؤں میں ڈالنے کی سنت رکھی ہوئی ہے۔ جب وہ ایمان لاتے ہیں تو انہیں ابتلاؤں میں ڈالا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ۝ (العنکبوت: ۳، ۴)

کیا لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائیں اور فتنہ میں نہ ڈالے جائیں صادق اور کاذب میں فرق کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ فتنہ میں ڈالے جائیں۔ تو جب کوئی ایمان لاتا ہے تو اس کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے ابتلاء مقدر کئے جاتے ہیں جن میں سے بعض تو اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ہوتے ہیں اور بعض خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں۔ مثلاً کسی کے ہاں بیٹا پیدا کیا جاتا ہے اور وہ مرجاتا ہے۔ یہ بیٹا اسی لئے پیدا کیا گیا تھا کہ اس کے ذریعہ ابتلاء میں ڈالا جائے یا اسی طرح کسی کا مکان گر جائے یا دشمن کوئی ضرر پہنچائے۔ اب اگر تدبیر ہی تدبیر ہے تو پھر کوئی وجہ

نہیں کہ انسان مقام صبر پر قائم رہے اور اپنے دشمن کے مقابلہ پر تدبیر سے کام نہ لے۔ مقام صبر پر وہ تبھی قائم رہ سکتا ہے جب کہ اسے معلوم ہو کہ میرا امتحان لیا جارہا ہے۔ ورنہ اگر تدبیر ہی ہوتی تو ایسے موقع پر وہ اور زیادہ جوش دکھلاتا۔ بہت دفعہ جماعت کے لوگ پوچھتے تھے کہ ہمیں اجازت ہو تو مخالفین پر ان کی شرارتوں کی وجہ سے مقدمہ دائر کریں۔ مگر حضرت صاحبؑ یہی کہتے کہ ہمیں صبر کرنا چاہئے حالانکہ دشمنوں کی شرارتوں کو روکنے کے لئے مقدمہ کرنا ناجائز نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ بعض دفعہ مؤمنوں پر ابتلاء خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں جن میں صبر دکھلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو مقام رضا اور صبر جو روحانیت کا ایک درجہ ہے وہ ایمان بالتقدیر سے ہی پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس کے ماتحت انسان سمجھتا ہے کہ مجھ پر یہ ابتلاء خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس پر صبر کرتا ہے اور اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ جو بات آتی ہے اس کے متعلق کہتا ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اچھی ہے اور گو ابتلاؤں کے ایک حصہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت تدبیر سے بھی کام لیتا ہے مگر ایک دوسرے حصہ کے متعلق خالی صبر اور رضا سے کام لیتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جس پر پہنچے ہوئے لوگ مصیبت اور تکلیف کے وقت حقیقی طور پر اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرۃ : ۱۵۷) کہتے ہیں۔

غرض تقدیر ہی کی وجہ سے انسان ان مقامات کو حاصل کرتا ہے اگر تقدیر نہ ہوتی اور انسان صبر کرتا تو وہ بے ہمتی ہوتی اور اگر رضا ہوتی تو وہ بے غیرتی ہوتی۔ لیکن تقدیر پر ایمان لاتے ہوئے جب وہ بعض ابتلاؤں پر جن کو وہ خالص آزمائش کہتا ہے اور صبر کرتا ہے تب اس کا صبر قابل تعریف ہوتا ہے۔ اور بعض ابتلاؤں کو جن کو وہ خالص ایمان خیال کرتا ہے خدا تعالیٰ کے فعل پر رضا کا اظہار کرتا ہے۔ تب اس کی رضا قابل تعریف ٹھہرتی ہے۔ اور بہترین صبر یہی ہے کہ انسان میں طاقت ہو اور پھر برداشت کرے۔ اگر طاقت ہی نہ ہو تو پھر برداشت کرنا ایسا اعلیٰ درجہ صبر کا نہیں ہے اور اسی طرح رضا یہی ہے کہ انسان اس بات کا یقین رکھتے ہوئے کہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہے اپنے دل میں بعض ابتلاؤں پر شرح صدر پاوے اور اگر یہ ایمان نہ ہو تو اس کو بے غیرتی کہیں گے۔ اور دونوں میں امتیاز اس طرح ہوتا ہے کہ مقام رضا پر پہنچا ہؤا انسان اپنے دوسرے اعمال میں نہایت چست اور باہمت اور محنتی ہوتا ہے اور اس کا حوصلہ دوسرے لوگوں کی نسبت غیر معمولی طور پر بڑھا ہؤا ہوتا ہے۔

رضا کے لفظ پر مجھے ایک بات یاد آگئی۔ حضرت صاحبؑ کی وفات سے پہلے ایام کا ذکر ہے

کہ ملک مبارک علی صاحب تاجر لاہور ہر روز شام کو اس مقام پر آجاتے جہاں حضرت صاحبؑ ٹھہرے ہوئے تھے اور جب حضرت صاحبؑ باہر سیر کو جاتے تو وہ اپنی بگھی میں بیٹھ کر ساتھ ہو جاتے تھے۔ مجھے سیر کے لئے حضرت صاحبؑ نے ایک گھوڑی منگوا دی ہوئی تھی میں بھی اس پر سوار ہو کر جایا کرتا تھا اور سواری کی سڑک پر گاڑی کے ساتھ ساتھ گھوڑی دوڑاتا چلا جاتا تھا اور باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ لیکن جس رات حضرت صاحبؑ کی بیماری میں ترقی ہو کر دوسرے دن آپؑ نے فوت ہونا تھا میری طبیعت پر کچھ بوجھ سا محسوس ہوتا تھا۔ اس لئے میں گھوڑی پر سوار نہ ہؤا۔ ملک صاحب نے کہا میری گاڑی میں ہی آجائیں۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا لیکن بیٹھتے ہی میرا دل افسردگی کے ایک گہرے گڑھے میں گر گیا۔ اور یہ مصرع میری زبان پر جاری ہو گیا کہ۔

راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہو

ملک صاحب نے مجھے اپنی باتیں سنائیں۔ میں کسی ایک آدھ بات کا جواب دے دیتا تو پھر اسی خیال میں مشغول ہو جاتا۔ رات کو ہی حضرت صاحبؑ کی بیماری یک دم ترقی کر گئی اور صبح آپؑ فوت ہو گئے۔ یہ بھی ایک تقدیر خاص تھی جس نے مجھے وقت سے پہلے اس ناقابل برداشت صدمہ کے برداشت کرنے کے لئے تیار کر دیا۔

اسی طرح صوفیاء کے متعلق لکھا ہے کہ جب ان کو بعض ابتلاء آئے اور انہیں پتہ لگ گیا کہ یہ ابتلاء خالص آزمائش کے لئے ہیں تو گو لوگوں نے ازالہ کے لئے کوشش کرنی چاہی انہوں نے انکار کر دیا اور اسی تکلیف کی حالت میں ہی لطف محسوس کیا۔

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ ابتلاء آتے کیوں ہیں؟ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ اول تو عموماً اس لئے آتے ہیں کہ انسان کا ایمان مضبوط ہو۔ لیکن اس لئے نہیں کہ خدا تعالیٰ کو اس کا علم نہیں ہوتا بلکہ اس لئے کہ خود انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ میرے ایمان کی کیا حالت ہے۔ چنانچہ ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک عورت کی لڑکی سخت بیمار تھی۔ وہ روز دعا کرتی تھی کہ اس کی بیماری مجھے لگ جائے اور میں مرجاؤں۔ ایک رات کو گائے کا مونہہ ایک تنگ برتن میں پھنس گیا اور وہ اسے برتن سے نکال نہ سکی۔ اور گھبرا کر اس نے ادھر ادھر دوڑنا شروع کیا۔ اس عورت کی آنکھ کھل گئی اور ایک عجیب قسم کی شکل اپنے سامنے دیکھ کر اس نے سمجھا کہ ملک الموت جان نکالنے کے لئے آیا ہے۔ اس عورت کا نام مہتی تھا بے اختیار ہو کر

پکارنے لگی کہ اے ملک الموت میں مہتی نہیں ہوں۔ میں تو ایک غریب محنت کش بڑھیا ہوں اور اپنی لڑکی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ یہ مہتی لیٹی ہوئی ہے اس کی جان نکال لے۔ یہ عورت خیال کرتی تھی کہ اسے اپنی لڑکی سے محبت ہے۔ لیکن جب اس نے سمجھا کہ جان نکالنے والا آیا تو کھل گیا کہ اسے محبت نہ تھی کہ وہ اس کے بدلے جان دے دے۔ یہ تو ایک حکایت ہے لیکن یہ بات کثرت سے پائی جاتی ہے کہ انسان بسا اوقات اپنے خیالات کا بھی اچھی طرح اندازہ نہیں کر سکتا اور جب اس پر ابتلاء آتے ہیں تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کسی چیز سے محبت یا نفرت کا دعویٰ کہاں تک صادق تھا۔

اسی طرح ابتلاء میں اس لئے ڈالا جاتا ہے کہ تا لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ فلاں کا ایمان کیسا ہے ورنہ یوں دوسروں کو کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں کا ایمان پختہ ہے یا نہیں۔ اسی لئے رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ کوئی انسان جتنا بڑا ہو اس پر اتنے ہی بڑے ابتلاء آتے ہیں اور سب سے زیادہ ابتلاء نبیوں کو آتے ہیں (ترمذی۔ ابواب الزھد باب فی الصبر علی البلاء) جیسا کہ حضرت صاحبؑ نے اپنے متعلق فرمایا ہے۔

کربلائیست سیر ہر آنم صد حسین است در گریبانم

لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ آپؑ نے حضرت امام حسینؓ کی ہتک کی ہے لیکن نادان نہیں جانتے کہ حضرت صاحبؑ نے اپنے ابتلاؤں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ امام حسینؓ تو ایک بار مارے گئے لیکن مجھے دشمن ہر وقت مارنے کے درپے رہتے اور ایذائیں دیتے ہیں اور میں ہر وقت کربلا کا نظارہ دیکھتا رہتا ہوں۔ سولی پر ایک دفعہ چڑھ کر مرنا اتنی بڑی بات نہیں جتنی کہ ہر وقت ابتلاؤں میں پڑے رہنا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ یسوع مسیحؑ چونکہ سولی پر چڑھ کر مر گئے اس لئے ان کو خدا کا بیٹا مان لو۔ ہم کہتے ہیں پھر جو ہر وقت سولی چڑھائے جاتے ہیں ان کو کیا ماننا چاہئے؟ سب انبیاءؑ کی یہی حالت ہوتی ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو لوگ دیکھ لیتے ہیں اور ان پر ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کا بہت ہی پختہ ایمان ہے۔ کہتے ہیں اَلْاِسْتَقَامَۃُ فَوْقَ الْکَرَامَۃِ۔ اور سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ دشمن بھی خوبی کو مان لے اور اس کا انکار نہ کر سکے۔ اب دیکھو دشمنوں نے رسول کریم ﷺ پر بڑے بڑے اعتراض کئے ہیں لیکن وہ یہ لکھنے پر بھی مجبور ہو گئے ہیں کہ اور تو جو کچھ تھا مگر محمد (ﷺ) نے اپنے کام کو ایسے طرز اور استقلال سے چلایا کہ جب تک پورا پورا یقین نہ ہو کوئی اس طرح چلا نہیں سکتا اور وہ قطعاً جھوٹا نہ تھا۔ تو جن یورپین

مصنفوں نے عقل سے کام لیا اور رسول کریم ﷺ کے واقعات کو دیکھا مان لیا کہ آپؐ نے ایسے استقلال سے کام کیا کہ کوئی جھوٹا انسان اس طرح نہیں کر سکتا۔ تو اس لئے بھی ابتلاء آتے ہیں کہ خوبی کا دشمنوں تک کو بھی اعتراف کرنا پڑے۔

پس ایمان کی ترقی اور مضبوطی کے لئے ابتلاء آتے ہیں اور بار بار آتے ہیں تا خوب مشق ہو جائے۔ دیکھو ایک لوہار جب لوہے پر ہتھوڑا مارتا ہے تو جو چیز وہ بنانا چاہتا ہے وہ بنتی جاتی ہے۔ لیکن کوئی اور شخص جسے ہتھوڑا چلانا نہیں آتا وہ ہتھوڑا مارے گا کہیں اور پڑے گا کہیں اور۔ ایک دفعہ جب کہ میں ابھی بچہ ہی تھا اور مکان بن رہا تھا۔ میں نے سمجھا تیشہ سے لکڑی گھڑنا آسان بات ہے اور یہ سمجھ کر لکڑی پر تیشہ مارا لیکن اپنا ہاتھ کاٹ لیا۔ تو جس کام کی انسان کو مشق نہ ہو اسے نہیں کر سکتا۔ فوجی سپاہیوں کو کئی کئی میل دوڑایا جاتا ہے۔ لیکن اس لئے نہیں کہ انہیں دکھ دیا جائے بلکہ اس لئے کہ انہیں دوڑنے کی مشق ہو اور وہ مضبوط ہوں تاکہ اگر کبھی دوڑنے کا موقع پڑے تو وہ دوڑ سکیں۔ تو خدا تعالیٰ انسان کے اخلاق کو اعلیٰ اور پختہ بنانے کے لئے مشق کرانے کی غرض سے ابتلاؤں میں ڈالتا ہے۔ مثلاً جب کوئی گالیاں دے تو اس پر صبر کرنا اور آگے سے گالیاں نہ دینا ایک صفت ہے۔ لیکن یہ صفت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے؟ اس طرح کہ کوئی کسی کو گالی دے اور وہ اس پر صبر کرنا سیکھے ورنہ اگر ایسا نہ ہو تو اس صفت کے اظہار کا موقع ہی نہ آئے۔ اور اگر کبھی موقع آئے تو اس پر پوری طرح انسان کاربند نہ ہو سکے۔ پس اخلاق کی پختگی کے لئے ابتلاؤں کا آنا اور ان کے آنے کے وقت صبر و رضا کی عادت ڈالنا ایمان کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس سے گالیاں دلائی جائیں گی اس پر جبر ہو گا اور وہ جبر کے ماتحت گالیاں دے گا۔ مگر یہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ گالیاں کسی نیک اور بزرگ انسان سے نہیں دلائی جاتیں نہ کسی بد آدمی کو گالیاں دینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ صرف یہ کیا جاتا ہے کہ نیک آدمی کے متعلق ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ اس کا اور ایک درشت آدمی کا اجتماع ہو جاتا ہے۔ آگے وہ شخص جس طرح اوروں سے خود معاملہ کرتا ہے اس سے بھی کرتا ہے اس میں کسی قسم کا جبر نہیں ہوتا۔

درجہ سوم

تیسرا مرتبہ تقدیر پر ایمان لانے کا بہت اعلیٰ ہے اور وہ توکل ہے۔ توکل کے معنی اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے ہیں۔ توکل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک توکل ایسا ہے

کہ اس کے لئے تقدیر خاص کے اظہار کی ضرورت نہیں ہوتی انسان اسباب سے کام بھی لیتا ہے اور خدا تعالیٰ پر بھروسہ رکھتا ہے کہ وہ اس کی محنت کو رائیگاں نہ کرے گا اور غیر معمولی حوادث سے اس کی حفاظت کرے گا۔ اس قسم کے توکل میں گو انسان یہ امید کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غیر معمولی حوادث سے بچانے کے لئے خود اپنے فعل سے بندہ کا کام کردے گا کہ اس کے اعمال کے نیک نتائج پیدا کرے گا مگر اسباب کو ترک نہیں کرتا۔

دوسری قسم توکل کی یہ ہے کہ انسان اسباب کو بھی ترک کر دیتا ہے مگر یہ توکل اعمال شریعت کے متعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان نماز یا روزہ یا حج یا زکوٰۃ خدا تعالیٰ کے سپرد کردے کہ وہ کہے گا تو نماز پڑھ لوں گا یا روزہ رکھوں گا۔ بلکہ اس قسم کا توکل صرف اعمالِ جسمانی میں ہوتا ہے جو لوگ شرعی احکام کے متعلق ایسا کہتے ہیں وہ جھوٹ کہتے ہیں۔ یہ لوگ اباحتی ہوتے ہیں اور انہوں نے شریعت کے احکام سے بچنے کے لئے کئی قسم کے ڈھکوسلے بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہتے ہیں کہ شریعت کے احکام پر عمل کرنا تو ایسا ہے جیسے پار اترنے کے لئے کشتی پر سوار ہونا۔ پس یہ کون سی عقل کی بات ہے کہ انسان ہمیشہ کشتی میں ہی بیٹھا رہے اور جب منزل مقصود آگئی خدا مل گیا تو پھر کشتی میں ہی کیوں بیٹھا رہے۔ لیکن یہ مثال ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے وصال کا ایک مقام نہیں کہ وہاں پہنچ کر اتر جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بے پایاں ہے اور اس کے وصال کے بے انتہاء مدارج ہیں۔ پس اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے دریا کے ساتھ ساتھ ہزاروں لاکھوں شہر بستے ہیں اور کوئی شخص ان سب کی سیر کو چلے۔ یہ شخص بیوقوف ہو گا اگر پہلے شہر میں پہنچ کر کشتی سے اتر جاوے کیونکہ پھر اس کے لئے آگے جانا ناممکن ہو جائے گا۔

غرض توکل کا مقام یہ ہے کہ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینا کہ وہ جس طرح چاہے اپنی تقدیر خاص بندہ کے متعلق جاری کرے۔ لیکن یہ توکل اعمال شریعت کے متعلق نہیں ہوتا بلکہ اعمال دنیا کے متعلق ہوتا ہے۔ جو شخص یہ کہے کہ میں نے اپنی نماز خدا کے سپرد کر دی ہے اب مجھے پڑھنے کی ضرورت نہیں وہ مسلمان نہیں رہ سکتا بلکہ کافر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نماز کے متعلق تو خدا تعالیٰ ایک دفعہ حکم دے چکا ہے۔ جو کوئی شخص نماز خدا تعالیٰ کے سپرد کرتا ہے وہ درحقیقت نماز کا چور ہے۔ کیا جو حکم محمد رسول اللہ ﷺ کی معرفت اسے ملا تھا وہ اس کے لئے کافی نہ تھا کہ اب وہ اور احکام کا منتظر رہے۔ توکل صرف ایسے ہی کاموں کے متعلق ہوتا

ہے جو مباح ہوں اور جن کے متعلق کوئی خاص حکم نازل نہ ہو چکا ہو اور وہ امور دنیوی اور جسمانی ہی ہوتے ہیں۔ ان کاموں کو جب کوئی بندہ خدا تعالیٰ کے سپرد کرتا ہے تو گویا وہ عرض کرتا ہے کہ الٰہی! تُو میرے یہ کام کر دے تاکہ میں دین کے کام کر سکوں۔ تیری عبادت کر سکوں۔ تیری راہ میں کوشش کر سکوں۔ اس لئے یہ توکل دراصل خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے ہوتا ہے مگر یہ مقام کبھی حاصل نہ ہو سکتا اگر تقدیر نہ ہوتی۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ نے کچھ کرنا ہی نہ ہوتا تو اس کے سپرد اپنے کام کر دینے کا ہی کیا مطلب؟ اور کسی شخص کو اگر تقدیر پر ایمان نہ ہو تو اسے بھی یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر وہ اس امر کو مانتا ہی نہیں کہ خدا تعالیٰ بھی بندہ کے کاموں میں دخل دے سکتا ہے تو وہ اپنے کام اس کے سپرد کرے گا ہی کیوں؟ پس تقدیر پر ایمان لانا توکّل کا درجہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ جب انسان اس مقام پر پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور دین کی خدمت میں ایسا لطف پاتا ہے کہ اپنی دنیاوی محنتیں کم کر دیتا ہے اور اپنے دنیاوی کام اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ وہ ان کو پورا کر دے گا اور اس کو دین کی خدمت کے لئے فارغ کر دے گا۔

توکّل کے اس درجہ سے اوپر ایک اور درجہ ہے جس میں انسان اسباب معیشت کے حصول کے لئے محنت کرنا بالکل ہی چھوڑ دیتا ہے اور اپنا سارا وقت ہی اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کر دیتا ہے اور دنیا سے بکلی انقطاع کر لیتا ہے اور اس سے بھی اوپر ایک اور درجہ ہے کہ انسان اس درجہ میں بعض اوقات حوائج ضروریہ کا پورا کرنا ترک کر دیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مثلاً بھوکا مرجاتا ہے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ لکھتے ہیں کہ مجھ پر بعض اوقات ایسی حالت آتی ہے کہ اس حالت میں مَیں نہیں کھاتا جب تک خدا تعالیٰ نہ کہے تجھے میری ہی ذات کی قسم تُو کھا تب میں کھاتا ہوں۔ اور نہیں پیتا جب تک خدا تعالیٰ نہ کہے کہ تجھے میری ہی ذات کی قسم تُو پی تب میں پیتا ہوں۔ میں کپڑے نہیں پہنتا جب تک خدا تعالیٰ نہ فرمائے کہ تجھے میری ہی ذات کی قسم تُو کپڑے پہن لے تب میں کپڑے پہنتا ہوں۔ ان کی عادت تھی کہ ایک ہزار دینار کا کپڑا پہنتے۔ جس پر لوگ اعتراض کرتے تو کہتے نادان نہیں جانتے خدا تعالیٰ مجھے ایسا ہی کپڑا پہننے کے لئے کہتا ہے تو میں کیا کروں؟

ایسے لوگوں کا خدا تعالیٰ متکفل ہو جاتا ہے اور اس مرتبہ کا نام مقام فنا ہے۔ آج کل کے نادان بزرگوں سے سن کر یہ تو جانتے ہیں کہ یہ بھی کوئی مقام ہے لیکن وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا

ہوتا ہے۔ اس مقام کے لوگوں کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کوئی شراب پی کر بالکل ہی بے خبر ہو جائے۔ اسی طرح اس مقام پر پہنچے ہوئے لوگ خدا تعالیٰ کی محبت سے مخمور ہو کر دنیا سے بالکل غافل ہو جاتے ہیں۔ اور جب ان کی یہ حالت ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ ان کا ہر ایک کام کرتا ہے۔ نادان لوگ کہتے ہیں کہ اس نشہ کی حالت میں اولیاء اللہ جو چاہیں کہہ دیتے ہیں اور خلافِ شریعت باتیں بھی ان کے مونہہ سے نکل جاتی ہیں۔ اور بعض اسی خود ساختہ مسئلہ کی آڑ میں کہہ دیتے ہیں کہ مرزا صاحبؑ بھی اس مقام پر پہنچ کر دھوکے میں پڑ گئے اور بعض خلاف شریعت دعویٰ کرنے لگے اس لئے ان کے وہ دعوے قابل قبول نہیں۔ مگر یہ لوگ نہیں جانتے کہ خدا تعالیٰ کی پلائی ہوئی شراب گو دنیا و مافیہا سے غافل کر دیتی ہے مگر عقل نہیں مارتی اور نہ دین سے غافل کرتی ہے۔ اس شراب کے پینے سے تو دین کی آنکھ اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ اور یہ وہ شراب ہوتی ہے کہ اس کے پینے سے تقویٰ اور طہارت بہت بڑھ جاتی ہے۔ مگر یہ لوگ خدا تعالیٰ کی محبت کی شراب کا قیاس اس شراب پر کرتے ہیں جو گندم یا گڑ کو سڑا کر بنائی جاتی ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کی پلائی ہوئی شراب سے مراد وہ محبت کا جام ہے جو وہ اپنے برگزیدوں کو پلاتا ہے اور جو ایک طرف اگر بندہ کے دل سے دنیا کا خیال محو کر دیتا ہے تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ اور اس کے جلال کا نقش اس کے دل پر اور بھی گہرا کر دیتا ہے۔

**درجہ چہارم** اس کے بعد تقدیر پر ایمان انسان کو اور اوپر لے جاتا ہے اور وہ درجہ عبد پر پہنچ جاتا ہے۔ اس درجہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پرانا شرابی اس قدر شراب کا عادی ہو جاتا ہے کہ بوتلوں کی بوتلیں انڈیل جاتا ہے مگر اسے نشہ نہیں آتا۔ اس درجہ پر پہنچنے والا انسان بھی اللہ تعالیٰ کی محبت کی شراب اس قدر پیتا ہے کہ اب وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے اور اس حالت سے اوپر آجاتا ہے جو اسے پچھلے درجہ میں حاصل ہوئی تھی۔ اور اب یہ اس درجہ فنا سے جس پر پہلے تھا اوپر چڑھ جاتا ہے اور بے خودی کا رنگ جاتا رہتا ہے بلکہ حواس تیز ہو جاتے ہیں اور یہ اپنے آپ کو عبودیت کے مقام پر کھڑا پاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی شان کو ایک اور نقطہ نظر سے دیکھنے لگتا ہے اور اپنے عبد ہونے کی طرف اس کی توجہ رجوع کرتی ہے اور یہ اپنے نفس کو کہتا ہے کہ میں تو عبد ہوں' غلام ہوں' میرا کیا حق ہے کہ اپنے آپ کو اپنے آقا پر ڈال دوں۔ اور یہ خیال کر کے وہ پھر تدبیر کی طرف یعنی تقدیر عام کی طرف لوٹتا ہے اور گو یہ سلسلہ روحانی کا نیا دور بھی اسی طرح تقدیر عام سے شروع ہوتا ہے جس طرح پہلا دور اس سے

شروع ہؤا تھا۔ اور اس مقام پر بندہ نہایت ادب کے ساتھ خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے سامانوں کو کام میں لانا شروع کرتا ہے کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھتا ہے اور تمام ضروریات کے موقعوں پر خوب اسباب سے کام لیتا ہے۔ آج کل نادان انسان اعتراض کرتے ہیں کہ مرزا صاحب تدبیریں کیا کرتے تھے۔ حالانکہ جو انسان عبودیت کے مقام پر ہو یا اس مقام سے اوپر گزر چکا ہو اس کے لئے بعض دفعہ یہ واجب ہوتا ہے کہ وہ تدبیر سے کام لے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کو گناہ ہو۔ عبودیت کے مقام پر پہنچا ہؤا انسان سب کام کرتا ہے اور ہر بات کے لئے جو اسباب مقرر ہیں ان سے کام لیتا ہے اور بعض دفعہ تو اس پر ایسی حالت آتی ہے کہ سوائے ان دعاؤں کے جن کا مانگنا اس کے لئے فرض کر دیا گیا ہے وہ اپنی طرف سے اپنے نفس کے لئے دعا بھی نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ دعا کرنا گویا تقدیر خاص کو بلانا ہے اور ایک غلام کا کیا حق ہے کہ وہ اپنے آقا کو اس طرح بلائے۔ یہی وہ حالت تھی جو حضرت ابراہیمؑ کو اس وقت حاصل تھی جب کہ ان کو آگ میں ڈالنے لگے تھے۔ اس وقت جبرائیلؑ ان کے پاس آئے اور آکر کہا کہ اگر خدا سے کچھ مدد مانگنا ہے تو مجھے کہو۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا تم کو کہنے کی کیا ضرورت ہے خدا تعالیٰ خود جانتا ہے۔ انہوں نے کہا پھر خدا سے کہو۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا وہ خود دیکھ رہا ہے میں اسے کیا کہوں؟

تو اس درجہ پر پہنچ کر انسان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ عبودیت میں محو ہو کر اللہ تعالیٰ کے رعب اور شان کو دیکھ کر اس کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھا سکتا کیونکہ اس وقت اس کی آنکھیں تمام طرف سے بھری ہوئی ہوتی ہیں اور اس کی نظر صرف عبودیت پر ہی ہوتی ہے۔

**درجہ پنجم**

پھر اس کے آگے بندہ اور ترقی کرتا ہے اور اپنی عبودیت کا جب مطالعہ کر چکتا ہے اور اپنے اوپر تقدیر عام جاری کرتے کرتے وہ اپنے نفس کی کمزوریوں کو خوب محسوس کر لیتا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے کہ خدا نے آخر تقدیر خاص کیوں جاری کی؟ اس لئے کہ میں اس کا عبد ہوں اور مجھ میں کمزوریاں ہیں۔ پس اس سے کام نہ لینا بھی ناشکری ہے اور اس پر وہ خاص تقدیر سے کام لینا شروع کرتا ہے۔ یعنی دعا سے کام لیتا ہے اور یہ مقام مقامِ دعا کہلاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر وہ خدا سے دعا مانگتا ہے۔ جب کوئی روک اس کے سامنے آتی ہے تو کہتا ہے خدا تعالیٰ نے تقدیر خاص اس لئے رکھی ہے کہ میں ایسے موقع پر اس سے کام لوں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ ایک شخص ثمردار درخت کے نیچے بیٹھا ہو اور ایک لمبا بانس

اس کے پاس ہو۔ جب اسے بھوک لگے درخت سے پھل جھاڑے۔ گو وہ اس کے لئے کوشش تو خود کرتا ہے مگر بانس اس کو مل جاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچا ہؤا انسان دنیا کی اصلاح اور اس کو عبودیت کی طرف لانے میں کوشاں ہوتا ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ جانتا ہے کہ میں عبد ہو کر یہ کام نہیں کر سکتا اس لئے اپنے آقا کو ہی لکھنا چاہئے۔ پس جب وہ ضرورت سمجھتا ہے اپنے آقا کو لکھتا ہے یعنی خدا تعالیٰ کے حضور دعا کرتا ہے کہ فلاں کام میں مدد دیجئے اور وہاں سے مدد آجاتی ہے۔ اس وقت تدبیر اس کی نظر میں حقیر ہوتی ہے۔ اور اپنے آپ کو عبد سمجھتا ہے۔ مگر اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبد اپنے آقا کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ پھر اس سے آگے انسان چلتا ہے۔ مگر جوں جوں انسان آگے چلتا ہے اسی عبد کے مختلف مقامات پر پہنچتا ہے اس سے اوپر اور کوئی درجہ نہیں۔ بلکہ بڑے سے بڑا درجہ بھی عبد کے درجہ کی کوئی شاخ ہی ہے اس سے علیحدہ نہیں۔ حتیٰ کہ رسول کریم ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ عبد ہی کہتا ہے اور سب واقفانِ اسرارِ شریعت کا اتفاق ہے کہ سب سے بڑا درجہ روحانی ترقی میں عبد ہونے کا ہی ہے۔ اور وہ لوگ جھوٹے ہیں جو کہتے ہیں کہ اس سے آگے ابن اللہ کا درجہ ہے۔ سب سے بڑا عبودیت کا ہی درجہ ہے اور مقامِ دعا بھی اسی درجہ کی ایک اعلیٰ شاخ ہے۔

غرض مقام دعا پر جب انسان پہنچتا ہے تو جب کوئی روک اس کے راستہ میں آتی ہے وہ فوراً اللہ تعالیٰ کے حضور میں گر جاتا ہے اور اس کی مدد سے اس روک کو دور کرتا ہے۔

جنگ احزاب کا واقعہ ہے کہ خندق کھودتے ہوئے صحابہؓ ایک پتھر کو کاٹنا چاہتے تھے مگر وہ نہ کٹتا تھا۔ اس پر رسول کریم ﷺ کے پاس گئے جن کے وہ عبد تو نہ تھے مگر بوجہ اس درجہ کے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دیا تھا آپؐ کے غلاموں میں شمار ہونا فخر سمجھتے تھے۔ آپؐ سے دریافت کیا کہ اب ہم کیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا۔ لاؤ مجھے کدال دو۔ اور کدال لے کر آپؐ اس جگہ گئے اور اسے اٹھا کر زور سے پتھر پر مارا تو اس سے آگ نکلی۔ آپؐ نے کہا اللہ اکبر۔ سب صحابہؓ نے بھی کہا۔ اللہ اکبر۔ دوسری بار مارا تو پھر آگ نکلی اور آپؐ نے کہا اللہ اکبر۔ صحابہؓ نے بھی کہا اللہ اکبر۔ پھر تیسری بار مارا۔ پھر آگ نکلی اور آپؐ نے اللہ اکبر کہا اور صحابہؓ نے بھی کہا۔ اللہ اکبر۔ تیسری بار مارنے سے پتھر ٹوٹ گیا۔ اس موقع پر صحابہؓ رسول کریم ﷺ کی اتباع میں اللہ اکبر کہتے رہے ورنہ انہیں پتہ نہ تھا کہ آپؐ کیوں اللہ اکبر کہتے ہیں؟ اس لئے انہوں نے بعد میں رسول کریم ﷺ سے پوچھا کہ اللہ اکبر کہنے کی وجہ کیا تھی؟ آپ

نے فرمایا ۔ جب پہلی بار آگ نکلی تو اس میں مجھے کسریٰ اور حیرہ کے قصر دکھائے گئے اور بتایا گیا کہ ان پر مسلمانوں کو غلبہ دیا جائے گا۔ پھر میں نے کدال ماری تو اس کی روشنی میں مجھے حیرہ کے قصر دکھائے گئے۔ اور بتایا گیا کہ قیصر کی اس مملکت پر مسلمانوں کو قبضہ ملے گا پھر جب میں نے تیسری دفعہ کدال ماری اور روشنی نکلی تو مجھے صنعا (یمن) کے قصر دکھائے گئے اور بتایا گیا کہ ان پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگا۔ (الکامل فی التاریخ لابن الاثیر جلد نمبر۲ صفحہ ۱۷۹ مطبوعہ بیروت ۱۹۶۵ء)

غرض جب غلام کو اس کام میں کوئی روک نظر آتی ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہو تو وہ آقا ہی کے پاس جاتا ہے اور اس سے مدد طلب کرتا ہے۔ اسی طرح عبودیت کے مقام پر پہنچا ہؤا انسان دعاؤں میں خاص طور پر مشغول رہتا ہے اور ہر ایک مشکل کے وقت خدا تعالیٰ سے مدد طلب کرتا ہے۔ اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص باغ میں ہو اور اس کے پاس ایک لمبا بانس ہو جس وقت چاہے درختوں کو ہلا کر پھل گرالے۔

**درجہ ششم** تقدیر پر ایمان جب اور زیادہ ترقی کرتا ہے تو انسان اس درجہ سے بھی اوپر ترقی کرتا ہے اور دعاؤں کی قبولیت کا نظارہ دیکھ کر خدا کے اور قریب ہونا چاہتا ہے اور اس کے لئے کوشش کرتا ہے آخر یہ ہوتا ہے کہ اس کی کوشش ہو یا نہ ہو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی تقدیر جاری رہتی ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ سے ایک رنگ وحدت کا پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی مقام کے متعلق رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ بندہ نوافل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ایسا قریب ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اس کے ہاتھ' کان' آنکھ' پاؤں بن جاتا ہوں[عہ]۔ یعنی اس مقام پر جو کام بھی یہ بندہ کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کا ہی کام ہوتا ہے اور یہ کلی طور پر پاک ہو جاتا ہے اس مقام کا اعلان سوائے اللہ تعالیٰ کے حکم کے کوئی انسان نہیں کر سکتا۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مقام اور ہوتے ہیں اور حال اور ہوتا ہے۔ ہر مؤمن خدا تعالیٰ کا عبد ہوتا ہے۔ وہ توکل بھی کرتا ہے۔ دعا بھی کرتا ہے مگر ہر مؤمن پر ان باتوں کی ایک ایک آن آتی ہے اور وہ حال کہلاتا ہے۔ اور مقام یہ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات میں انسان اس پر قائم رہتا ہے اور آنی طور پر تھوڑی دیر کے لئے وہ حالت نہیں آتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص تو کسی گھر میں ٹھہرا ہؤا ہو اور دوسرا شخص بطور ملاقات تھوڑی دیر کے لئے وہاں آجائے ان دونوں کا درجہ ایک نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا شوق بڑھانے کے لئے کبھی کبھی اعلیٰ سے اعلیٰ مقام

عہ بخاری کتاب الرقاق باب التواضع

کی سیر اپنے بندوں کو کرا دیتا ہے۔ گو بعض نادان اس حالت سے دھوکا کھا کر عُجب اور تکبر کی مرض میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس پر صحابہؓ پہنچے تھے جن کے متعلق رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الممتحنۃ باب لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء) کہ تم اب جو چاہو کرو۔ نادان اعتراض کرتے ہیں کہ کیا اگر وہ چوری بھی کرتے تو ان کے لئے جائز تھا؟ مگر وہ نہیں جانتے کہ خدا جس کے ہاتھ ہو جائے وہ چوری کر ہی کس طرح سکتا ہے۔ دیکھو ٹائپ کی مشق کرنے والے اتنی مشق کر لیتے ہیں کہ آنکھیں بند کر کے چلاتے جاتے ہیں اور غلطی نہیں کرتے۔ اسی طرح ایک زمیندار خاص طریق سے زمین میں دانہ ڈالتا ہے اور جس کی مشق نہ ہو وہ اس طرح دانہ نہیں ڈال سکتا۔ اسی طرح ایک جلد ساز کو مشق ہوتی ہے اور وہ سُوا ایک خاص طرز سے مارتا ہے۔ پس جس طرح ان کاموں میں مشق کرنے والے غلطی نہیں کر سکتے۔ اس طرح تقویٰ کی راہوں پر چلنے کی مشق کرتے کرتے جب انسان اس حد تک ترقی کر جاتا ہے کہ خدا ان کی آنکھ۔ کان۔ ہاتھ اور پاؤں ہو جاتا ہے وہ غلطی نہیں کر سکتے۔ اندھے بھی اپنے گھروں میں دوڑتے پھرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک اندھی عورت رہتی تھی اس کی جہاں چیزیں ہوتیں سیدھی وہیں جاتی اور جا کر ان کو اٹھا لیتی۔ ناواقف لوگ بعض دفعہ ایسے اندھوں کو دیکھ کر خیال کر لیتے ہیں کہ یہ فریب کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کو مشق سے یہ درجہ حاصل ہؤا ہوتا ہے۔ ورنہ وہ فی الحقیقت اندھے ہوتے ہیں۔ پس جب اندھا بھی مشق سے اس درجہ کو حاصل کر سکتا ہے تو کیا عقل کا سوجاکھا ترقی کرتے کرتے اس مقام پر نہیں پہنچ سکتا کہ اس کا ہاتھ ہمیشہ صحیح جگہ پر ہی پڑے اور وہ غلطی سے محفوظ ہو جائے۔ اور خصوصاً جب کہ اللہ تعالیٰ کسی کے ہاتھ پاؤں ہو جائے تو پھر تو اس امر میں کوئی تعجب کی بات ہی نہیں رہتی۔ یہ درجہ بھی تقدیر پر ایمان کا نتیجہ ہے ورنہ اگر تقدیر ہی نہ ہوتی تو وہ تقدیر خاص سے کس طرح مدد لیتے؟ پس تقدیر خاص جاری کرنے کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ انسان عبودیت کے اس مقام پر پہنچ جائے کہ خدا تعالیٰ میں اور اس میں وحدت پیدا ہو جائے اور وہ گو عبد ہی رہے مگر اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہو جائے۔ مگر یہی مقام نہیں بلکہ اس سے آگے ایک ایسا مقام ہے کہ جس کو دیکھ کر انسان کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور وہ نبوت کا مقام ہے۔ کہتے ہیں جب خدا تعالیٰ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کان ہو گیا تو پھر اور کیا درجہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ غلط ہے اس سے اوپر اور درجہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے تو خدا بندے کا ہاتھ پاؤں اور کان ہؤا تھا۔

اس درجہ پر پہنچنے پر اس کے ہاتھ پاؤں آنکھ اور کان خدا تعالیٰ کے ہو جاتے ہیں اور یہی مقام ہے جہاں درحقیقت انسان تقدیر کی پوری حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے کیونکہ اس مقام پر یہ مجسم تقدیر ہو جاتا ہے اور تقدیر کو اگر پانی فرض کیا جائے تو یہ اس کو چلانے کے لئے بمنزلہ نہر کے ہوتا ہے اور اس مقام پر پہنچ کر خدا تعالیٰ کے راز میں شامل ہو جاتا ہے اور بندہ ہوتے ہوئے خدا کے نشان اس سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے نادان اسے خدا سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ پہلے تو یہ تھا کہ کبھی خدا سے مانگنے جاتا تھا مگر اب اس پر تقدیر ہی تقدیر جاری ہو جاتی ہے اور یہ وہ مقام ہے کہ اس پر پہنچنے والے انسان جو کچھ کرتے ہیں وہ ان سے خدا ہی کراتا ہے۔ اسی لئے خدا نے رسول کریم ﷺ کے متعلق فرمایا ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم: ۴-۵) کہ یہ جو کچھ کہتا ہے الہام ہے۔

اسی طرح حضرت صاحبؑ نے رؤیا میں دیکھا کہ آپؑ فرماتے ہیں کہ آؤ ہم نئی زمین اور نیا آسمان بنائیں۔ نادان کہتے ہیں کہ یہ شرک کا کلمہ ہے مگر نہیں یہ مقام نبوت کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت صاحبؑ نے پہلے مقام کا نام قمر اور دوسرے کا شمس رکھا ہے۔ یعنی پہلا مقام تو یہ ہے کہ خدا کے ذریعہ انسان کا نور ظاہر ہوتا ہے۔ اور دوسرا مقام یہ ہے کہ انسان کے ذریعہ خدا کا نور ظاہر ہوتا ہے۔ یہی معنی آپ نے الہام یَا شَمْسُ وَیَا قَمَرُ کے کئے ہیں۔ تو یہ مقام نبوت ہے اور اس مقام سے کوئی آگاہی نہیں دیا جاتا مگر بطور حال کے۔ سوائے ان لوگوں کے کہ جن کو اللہ تعالیٰ مقام نبوت پر کھڑا کرے۔ خدا تعالیٰ کا جلال انہی لوگوں کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے اور یہ خدا تعالیٰ کو دیکھنے کی کھڑکی ہوتے ہیں۔ جو ان میں سے ہو کر خدا کو دیکھنا نہ چاہے وہ خدا کو نہیں دیکھ سکتا۔

**درجہ ہفتم** چھٹا مقام تو یہ تھا کہ جو خدا کو نہ دیکھے وہ اس شخص کو نہیں دیکھ سکتا اور ساتواں یہ ہے کہ جو اس مقام پر کھڑے ہونے والے انسان کو نہ دیکھے وہ خدا کو نہیں دیکھ سکتا۔ یعنی چھٹے مقام کے متعلق تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اس مقام پر کھڑا ہونے والے شخص کو شناخت نہ کرے مگر خدا کو کرے۔ لیکن ساتواں مقام ایسا ہے کہ جو شخص اس پر کھڑے ہونے والے شخص کو شناخت نہیں کر سکتا وہ خدا کو بھی شناخت نہیں کر سکتا اور اسی کا نام کفر ہے۔ کیونکہ جب یہ خدا کے ہاتھ اور پاؤں بن جاتے ہیں تو جہاں یہ جائیں گے وہیں خدا جائے گا۔

اور جو ان کو نہیں دیکھتا یقینی ہے کہ وہ خدا کو بھی نہ دیکھ سکے اور جو خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھتا وہ کافر ہے۔

یہ مقام حال کے طور پر تو اور لوگوں پر بھی آتا ہے مگر مقام کے طور پر کسی نبی کے بغیر اور کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے اور اس میں تقدیر ایسے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے کہ اس کو سمجھنا ہر انسان کا کام نہیں ہے۔ ہاں اہل علم لوگ شناخت کر لیتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچے ہوئے انسان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ خدا ہی کا رنگ اس میں آجاتا ہے اور یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ جب تقدیر حقیقی طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کا وجود خدا تعالیٰ کے وجود میں مخفی ہو گیا تھا۔ پس آپ کا ہر ایک فعل درحقیقت خدا تعالیٰ کی طرف سے تھا۔ لیکن تم جو کچھ کرتے ہو یہ خدا تم سے نہیں کراتا کیونکہ تم خدا کے ہاتھ نہیں ہو۔ اگر کوئی بد نظری کرتا ہے تو خود کرتا ہے اور چوری کرتا ہے تو خود کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ اس سے ایسا نہیں کراتا۔ خدا تعالیٰ تو ان سے کام کروایا کرتا ہے جو اس کی صفات کے مظہر ہو جاتے ہیں اور وہ جن کا ہاتھ ہو جاتا یا پاؤں ہو جاتا ہے یا آنکھ ہو جاتا ہے یا کان ہو جاتا ہے یا جو اس کے ہاتھ ہو جاتے ہیں یا پاؤں ہو جاتے ہیں یا آنکھ ہو جاتے ہیں یا کان ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بشریت کی غلطی پر بھی اگر کوئی معترض ہو تو سزا پاتا ہے اور یہ تقدیر الٰہی کی وہ حد ہے جس سے انسان کو تعلق ہے۔

اب میں تقدیر پر ایمان لانے کے فوائد بھی بیان کر چکا ہوں اور ان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ مسئلہ روحانیت کو کامل کرنے کے لئے کس قدر ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کے ماننے کو ایمان کی شرط قرار دیا ہے۔

یہ ہے وہ مسئلہ تقدیر جس سے عام لوگ ٹھوکر کھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عنایت فرمائے کہ ہم اس کو صحیح طور پر سمجھیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔ آمین۔

---

۱۔ ایک صاحب سوال کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی حیثیت ممتحن ہی کی نہیں بلکہ رحیم و کریم کی ہے ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ٹھیک ہے۔ مگر اس حیثیت کا ظہور امتحان لینے کے بعد نمبر دیتے وقت ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ پرچہ لکھتے وقت بتا تا جائے کہ اس سوال کا جواب یہ لکھو اور اس کا یہ۔

۲۔ اس موقع پر کسی صاحب نے سوال کیا کہ قدر خیرہٖ و شرہٖ پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟ حضور نے فرمایا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ خیر کی جزاء بھی اللہ کی طرف سے ملتی ہے اور بدی کی سزا بھی خدا کی طرف سے۔ اس پر ایمان لانے کا یہ مقصد ہے کہ انسان "گندم از گندم بروید جو ز جو" کے مسئلہ پر ایمان رکھے اور خدا پر ظلم کا الزام نہ لگاوے۔ (منہ)